فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۹۶

از جولائی ۱۹۶۵ء تا دسمبر ۱۹۶۵ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست مضامین معارف

جلد ۹۶

از جولائی ۱۹۶۵ء تا دسمبر ۱۹۶۵ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۹۶ ماہ ربیع الاول ۱۳۸۵ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۶۵ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

مسلم یونیورسٹی کے خلاف جو آرڈیننس نافذ کیا گیا ہے وہ طاقت کا نہایت غلط استعمال ہے، اس لیے اس کے خلاف جس قدر بھی احتجاج کیا گیا ہے وہ بالکل صحیح ہے لیکن آرڈیننس بہرحال عارضی ہے، یونیورسٹی کے مستقل نظام پر اس کا اثر نہیں پڑتا، اصل مسئلہ یہ ہے کہ آیندہ حکومت اس کے دستور میں کیا تبدیلی کرتی ہے،

اس سلسلہ میں دو باتیں قابل غور ہیں، ایک یہ کہ مسلم یونیورسٹی ایک خود مختار تعلیمی ادارہ ہے۔ دوسرے اس حیثیت سے وہ اسلامی بھی ہے کہ اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ تعلیم کے ساتھ اسلامی تہذیب و روایات کے مطابق مسلمان طلبہ کی تربیت کیجائے جس کو موجودہ بحث میں اسلامی کردار سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو لوگ اسلام کے نام سے گھبراتے ہیں وہ اقلیتی کردار سے تعبیر کرتے ہیں، یہ کردار مسلمانوں کا مسلمہ دستوری حق ہے، اس لیے حکومت کو یونیورسٹی میں کسی ایسی تبدیلی کرنے کا اختیار نہیں ہے جس سے اس کے کردار اور خود مختاری میں فرق آئے۔

اس سلسلہ میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ اسلامی کردار سے مراد کیا ہے اور اس کے حدود کیا ہیں؟

چھاگلہ صاحب کے نزدیک جیسا کہ ان کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے، اس سے مراد اسلامی تہذیب و ثقافت کی تحقیقات ہے یعنی مسلم یونیورسٹی میں اسلامی تہذیب و ثقافت کی تحقیقات کو اہمیت دیجائے، لیکن یہ اسلامی کردار نہیں بلکہ ریسرچ یا علمی تحقیق ہے، جس کو یورپ کی بہت سی یونیورسٹیاں انجام دے رہی ہیں، اور انھوں نے اسلامیات پر جتنا کام کیا ہے وہاں تک پہنچنے کے لیے مسلم یونیورسٹی کو ایک مدت درکار ہوگی،

اگر اسلامی کردار اسی کا نام ہے تو پھر یہ ساری یونیورسٹیاں مسلم ہیں، ان میں اور مسلم یونیورسٹی میں فرق کیا ہوا؟

اصل میں جو لوگ اسلامی کردار کے مفہوم ہی سے ناآشنا ہیں یا انکی نگاہ میں اس کی کوئی اہمیت نہیں اور وہ اس کو نام نہاد ترقی پسندی اور قومی وحدت کے انضمامی تصور کے منافی سمجھتے ہیں ان کو اسلامی کردار کی تعیین کا کوئی حق نہیں ہے، ان کو اس کا تو حق ہے کہ وہ یونیورسٹی کے لیے اسلامی کردار کی ضرورت اور اہمیت ہی سے علانیہ انکار کر دیں لیکن اتنی اخلاقی جرأت نہیں، اس لیے وہ اس کو فرقہ پروری، رجعت اور علیحدگی پسندی کی آڑ لے کر مسخ کرتے رہتے ہیں، اس کی تعبیر و تعیین کا حق ان ہی لوگوں کو ہے جو اسلامی کردار کو مسلمانوں کا سرچشمۂ حیات اور تعمیر ملت کی بنیاد سمجھتے ہیں،

اس کے لئے تنہا اسلام کے بعض ظاہری مظاہر مثلاً دینیات کی رسمی تعلیم، ہوسٹلوں میں نماز کا انتظام، رمضان میں ڈائننگ ہال کی نمائشی بندش، اسلامی تقریبات کا انعقاد، میلاد کے جلسے، اور اسی قبیل کی دوسری ظاہری چیزیں کافی نہیں ہیں، بلکہ اس سے وہ اسلامی روح مراد ہے، جس سے مسلمان طلبہ میں دینی احساس، اسلامی شعائر کا احترام، ان کی عظمت، اور ملی غیرت و حمیت کا جذبہ بیدار رہے، یونیورسٹی کے احاطہ کے اندر اس کے کسی متوسل کو اسلامی عقائد و تصورات کی علانیہ مخالفت کی اجازت نہ دیجائے، اسلامی علوم و فنون کی تحقیقات اور دینی تعلیم کو خاص اہمیت دی جائے، یونیورسٹی کے تمام شعبوں میں خواہ تعلیمی ہوں، یا انتظامی مسلمانوں کی نمایاں اکثریت اور ان کا اقتدار ہو، انتظامی مجالس کے ارکان کی اکثریت کا انتخاب جمہوری طریقہ پر کیا جائے، حکومت کے نامزد کردہ ارکان کی تعداد کم سے کم رکھی جائے، غیر مسلم ارکان ایسے منتخب اور نامزد کئے جائیں، جو مسلمانوں کی تہذیب و روایات سے واقف اور یونیورسٹی کے ہمدرد و ہوا خواہ ہوں، ایسے غیر مسلموں کی آج بھی کمی نہیں ہے، اس کے بغیر یونیورسٹی کا کردار قائم نہیں رہ سکتا،

یہ چیز نہ رجعت پسندی ہے، اور نہ فرقہ پروری، اور نہ قومی وحدت اور سیکلرزم کے خلاف ہے، بلکہ اقلیتوں کا ایک تسلیم شدہ دستوری حق ہے، جس کو نہ حکومت سلب کر سکتی ہے، اور نہ کسی ترقی پسند کو اس کی اجازت دی جا سکتی ہے، خود ہندوستان میں ہندو یونیورسٹی ہندو کردار کا اور عیسائی مشنریوں کے بعض کالج عیسائی کردار کا نمونہ موجود ہیں، درحقیقت اُن کو ان کے کردار کے ساتھ قائم رکھنا ہی سیکلرزم اور جمہوریت ہے، مسلم یونیورسٹی اس معنی میں یقیناً سیکلر اور قومی ہے، کہ اس کے دروازے بلاتفریق مذہب و ملت سب فرقوں کے لئے کھلے ہوئے ہیں، اور وہ اختلاف مذہب کی بنا پر کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کرتی، اور آج سے نہیں، بلکہ علی گڑھ کالج کے قیام کے زمانے سے کر اب تک ہر زمانہ میں یہاں غیر مسلم طلبہ کی خاصی تعداد رہی ہے، جن میں بعض نامور لوگ بھی ہیں، لیکن اس معنی میں یقیناً مسلم ہے کہ اس کی فضا، اور اس کا کردار اسلامی اور اس میں مسلمانوں کی اکثریت اور اس کا اقتدار ہونا ضروری ہے، یہی حقوق ہندو یونیورسٹی کو بھی حاصل ہیں،

اسلامی کردار کے نام سے بھڑکنے کی ضرورت نہیں، یہ چیز قومی وحدت و یکجہتی کے قطعاً منافی نہیں، علیحدگی پسندگی مسلمانوں کے قومی مزاج کے خلاف ہے، انھوں نے کبھی کسی قوم اور کسی تہذیب سے چھوت نہیں کی، جہاں گئے، ملکی باشندوں میں گھل مل گئے، اور اُن کی اور اپنی تہذیب کو ملا کر تہذیبی یکجہتی پیدا کرنے کی کوشش کی، خود ہندوستان میں ایک مشترک تہذیب اور مشترک زبان پیدا کی جس میں دونوں تہذیبوں کے یکساں عناصر ہیں، اور ہندوستان کی احیائی ذہنیت سے پہلے یہ زبان اور یہ تہذیب ہندو مسلمانوں کے بڑے طبقہ کی مشترک تہذیب و زبان سمجھی جاتی تھی، مختلف ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہندوستان کو جو ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے متحدہ ملک بنایا، قومی وحدت کا تصور پیدا کیا، ان سے پہلے ہندوستان مختلف طبقوں اور

فرقوں میں بٹا ہوا تھا، اور اُن میں باہم اتنا ہی بغض و عناد تھا، جتنا دشمنوں میں ہو سکتا ہے، اس لئے ہندوستان کی وحدت اور قومی یکجہتی کے پہلے معمار مسلمان ہی ہیں، اور علیحدگی پسندی کے وہ لوگ مجرم ہیں، جو وحدت کے ان آثار کو مٹانے کے درپے ہیں۔

آزاد مشرب ترقی پسندوں بلکہ تخریب پسندوں کا ایک طبقہ عرصہ سے مسلم یونیورسٹی کے روایات اور خصوصیات کو مٹانے کی کوشش میں مصروف ہے، لیکن وائس چانسلر صاحب ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، جو پشتہا پشت سے اسلامی تہذیب و روایات کا حامل رہا ہے، اور وہ خود اسی تہذیب کے پروردہ ہیں، ان سے بڑھ کر ان کا واقف کار اور کون ہو سکتا ہے، اس لئے ان سے توقع یہی ہے کہ وہ مسلم یونیورسٹی کی خصوصیات کو قائم رکھنے کی کوشش کریں گے، اُن کے سامنے اُن کے پیشرو بدرالدین طیب جی کی مثال موجود ہے، جن کو اسلامی تہذیب و روایات سے اتنا گہرا تعلق نہ تھا، جتنا موجودہ وائس چانسلر صاحب کو ہے، اس لئے ان پر اُن سے زیادہ اس کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے،

ابھی حال میں معلوم ہوا ہے کہ پاکستان کے ایک صاحب احسان بی آئے نے سیرۃ النبی کی پہلی اور دوسری جلد کا خلاصہ کیا ہے، اور ادبستان لاہور نے اس کو شائع کیا ہے، پاکستان کے لوگوں کو معلوم ہوگا کہ دارالمصنفین کی دارومدار کتابوں کی تجارت پر ہے، اس کو نہ حکومت سے کوئی مستقل ملتی ہے اور نہ اُس نے کبھی چندہ کیا، اب اگر ارض پاک والوں نے اس کی تجارتی آمدنی پر بھی قبضہ کر لیا، تو وہ کس طرح چل سکتا ہے، اُن کا فرض تو یہ تھا کہ وہ اس کی مشکلات میں مدد کرتے نہ کہ اُلٹے وہ اس کے ذرائع آمدنی پر قبضہ کر کے اس کو تباہ کرنا چاہتے ہیں، جو پاکستان کے لئے انتہائی شرم و غیرت

کی بات ہے، بعض اور کتابیں بھی پاکستانی ناشروں نے چھاپ لی ہیں، مگر وہ چنداں اہم نہ تھیں، اس لئے ہم نے خاموشی سے کام لیا، لیکن سیرۃ النبی دار المصنفین کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، اس کو کسی صورت میں بھی چھاپنا اس کو نقصان پہونچانا ہے، اس سے پہلے بھی ایک ناشر نے سیرۃ النبی جلد اوّل شائع کی تھی، اس وقت سردار عبد الرب نشتر مرحوم زندہ تھے انھوں نے دباؤ ڈال کر اس کی اشاعت رکوا دی تھی، پاکستان کے اخبارات نے بھی اس ناشر کو آڑے ہاتھوں لے لیا تھا، اس لئے اس نے مجبور ہو کر طباعت کے مصارف لے کر کتابیں دار المصنفین کے حوالے کر دی تھیں، ہم یہاں سے بیٹھ کر کیا کر سکتے ہیں، آ فرض پاکستانی اخبارات کا ہے کہ وہ خود غرض ناشروں کو ایسا سبق دیں کہ آئندہ کوئی اس قسم کی جرأت نہ کر سکے، نوائے وقت اور چٹان سے ہم کو خاص طور سے اسکی توقع ہے،

ہمارے رفیق سید صباح الدین عبد الرحمٰن کی دو کتابوں پر اس سے پہلے یوپی گورنمنٹ سے انعام مل چکا ہے، اس سال بھی اُن کی کتاب "ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں تمدنی جلوے" پر انعام ملا ہے، اس سال انشاء اللہ کچھ نئی کتابیں شائع کرنے کا ارادہ ہے، دین رحمت محدثین اسلام، تبع تابعین جلد دوم، صاحب مثنوی، مقالات سلیمانی جلد اول، عہد مغلیہ ہندوستانی مورخین کی نظر میں، دار المصنفین کی جبلی کی روداد کے لئے شائقین کا بڑا تقاضہ ہے، اس کی مختصر روداد معارف میں لکھی جا چکی ہے، تفصیلی روداد بھی انشاء اللہ جلد شائع کرنے کی کوشش کیجا رہی ہے،

مقالات
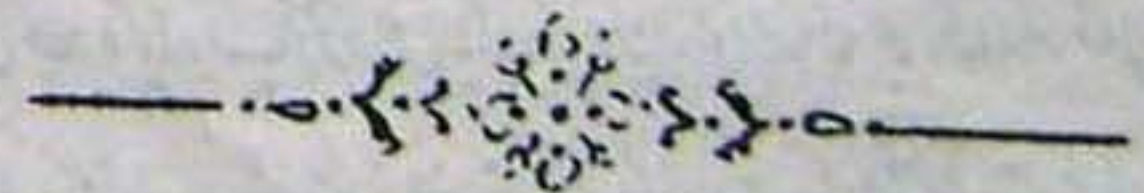
انسانی عظمت و شرف
اور
مرد مومن کی ذمہ داریاں

از
شاہ معین الدین احمد ندوی

انسانی عظمت و شرف اسلام سے پہلے انسانیت کا تصور بہت پست تھا، انسان پیدائشی گنہگار اور اپنے اعمال کے لحاظ سے ادنیٰ ترین مخلوق سمجھا جاتا تھا، وہ ہر طاقت کے سامنے سربسجود ہو جاتا تھا، اور ہر ادنیٰ اعلیٰ کا غلام تھا، اسلام پہلا مذہب ہے جس نے انسان کا درجہ تمام مخلوق میں بلند کیا اور اسکو اشرف المخلوقات قرار دیا، وہ خالق عالم کی صناعی کا شاہکار ہے، خدا نے اس کو حسین ترین خلقت عطا فرمائی۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (تین)	اور ہم نے انسان کو بہترین ساخت میں پیدا کیا

حدیثوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی شکل میں پیدا کیا،

خلق اللہ آدم علی صورتہ۔ (بخاری کتاب الاستیذان)	خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا

اس کو پیدائشی طور پر بے داغ ہر نقش سے پاک اور دین فطرت پر قرار دیا، پیدائش کے بعد ماحول

اور سوسائٹی اس پر اچھے برے نقش و نگار بناتی ہے۔

ان الانسان یولد علی الفطرۃ	انسان دین فطرت پر پیدا ہوتا ہے، اسکے
فابواہ یہودانہ او ینصرانہ	والدین اسکو یہودی یا نصرانی بناتے ہیں

حسن ظاہری کے ساتھ جمال معنوی یعنی علم و ادراک اور عقل و دانش کی دولت عطا فرمائی،

عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (علق)	انسان کو وہ باتیں سکھائیں جنکو وہ نہیں جانتا تھا،
عَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا (بقرہ)	اور خدا نے آدم کو سارے اسماء (حقائق اشیاء) سکھائے

اس کو خیر و شر کی تمیز عطا فرمائی،

وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا	اور قسم ہے انسان کی اور اس ذات کی جس نے
وَتَقْوَاهَا قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا	اس کو درست بنایا پھر اس کو بدکاری اور نیکوکاری
وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا	کی باتیں سمجھائیں جس نے اپنی روح کو پاک کیا وہ
(شمس)	کامیاب ہوا اور جس نے اسکو دبایا وہ گھاٹے میں رہا
وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ (بلد)	اور ہم نے اسکو (نیکی اور بدی) دونوں کے راستے دکھائے۔

اعلیٰ درجہ کی عقلی و ذہنی قوتوں سے آراستہ کیا، چنانچہ کلام مجید میں بکثرت انسانی عقل سے خطاب کیا گیا ہے، اور اس کو کائنات پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے، (افلا یتدبرون۔ افلا یتفکرون اور افلا یعقلون اتنی آیتوں میں آیا ہے کہ انکا شمار مشکل ہے،

اس کو ساری مخلوق پر فضیلت عطا کی گئی

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ	اور ہم نے بنی آدم کو بزرگی اور برتری عطا فرمائی۔
فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ	اور اس کو دریا اور خشکی میں سوار کیا اور پاکیزہ
الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى	چیزیں اس کو کھانے کو دیں اور اس کو بہت سی

كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (بنی اسرائیل)	مخلوق پر فضیلت عطا فرمائی۔

اس کے سر پر خلافت اور نیابت الٰہی کا تاج رکھا، وہ مسجود ملائکہ قرار پایا اور اس کی عظمت سے انکار پر ابلیس ہمیشہ کے لیے مردود قرار دیا گیا،

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي	اور جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے
جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا	کہا کہ میں روئے زمین میں اپنا نائب بنانے والا
أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا	ہوں تو فرشتوں نے کہا کیا تو ایسے شخص
وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ	کو نائب بناتا ہے جو اس میں فساد پھیلائے
بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ	اور خونریزی کرے اور ہم تیری حمد و ثنا
إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝ وَعَلَّمَ	کے ساتھ تیری تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں
آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ	خدا نے کہا میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے
عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي	اور آدم کو سب چیزوں کے نام بتائے،
بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ	پھر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش
قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا	کرکے فرمایا کہ اگر تم اپنے قول میں سچے ہو تو
إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ	ان چیزوں کے نام بتاؤ، فرشتے بولے تیری
الْحَكِيمُ - قَالَ يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ	ذات پاک ہے جو تو نے ہم کو بتایا ہے
بِأَسْمَائِهِمْ فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ	اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے بیشک
قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ إِنِّي أَعْلَمُ	تو ہی جاننے والا اور مصلحت کا پہچاننے والا
غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ	ہے، تب خدا نے فرمایا اے آدم تم فرشتوں
مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ	کو ان چیزوں کے نام بتاؤ پھر جب آدم نے

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (بقرہ ۴)

فرشتوں کو ان کے نام بتائے تو خدا نے
فرشتوں سے فرمایا کیا ہم نے تم سے نہیں کہا
تھا کہ آسمان و زمین کی سب مخفی چیزیں ہم کو
معلوم ہیں، اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور
جو کچھ تم چھپاتے ہو وہ سب ہم کو معلوم ہے
اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کے
سامنے جھکو تو شیطان کے سوا سب جھک پڑے،
اس نے نہ مانا اور غرور میں آگیا اور نافرمان بن
گیا۔

اقبال نے تخلیق آدم کے واقعہ سے انسانی عظمت کے بڑے لطیف پہلو پیدا کیے ہیں لکھتے ہیں:

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد ‏ ‏ حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
خبرے رفت ز گردوں بہ شبستانِ ازل ‏ ‏ حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور ‏ ‏ خودگرے خود شکنے خودنگرے پیدا شد
آرزو بے خبر از خویش بہ آغوشِ حیات ‏ ‏ چشم وا کرد و جہانے دگرے پیدا شد
زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر ‏ ‏ تا ازیں گنبد دیرینہ درے پیدا شد

اس سے بڑھ کر انسانی عظمت تصور میں نہیں آسکتی، اس سے پہلے انسان بدترین قسم کی غلامی میں مبتلا تھا، وہ چاند، سورج، سمندر، پہاڑ، شجر و حجر بلکہ ادنی ادنی جانوروں تک کی پوجا کرتا تھا، اسلام نے بتایا کہ یہ چیزیں اس کی پرستش کے لیے نہیں بلکہ اس کی خدمت اور انتفاع کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (بقرہ ۵)

زمین میں جو کچھ ہے سب خدا نے تمھارے لیے بنایا،

پوری کائنات کو اس کے لیے مسخر کر دیا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ (حج)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ روے زمین میں جو کچھ ہے
سب کو تمھارے لیے مسخر کر دیا۔

حتی کہ آفتاب و ماہتاب بھی جس کی انسان پوجا کرتا ہے، اس کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌ بِاَمْرِهٖ (نحل)

اور خدا نے رات اور دن، چاند اور سورج
کو تمھارے کام میں لگا دیا اور ستارے اسکے
حکم سے کام میں لگے ہوئے ہیں۔

اقبال نے اس کو بڑے مؤثر اور دلکش انداز میں نظم کیا ہے

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کیلئے ‏ ‏ جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کیلئے
یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں ‏ ‏ ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں ‏ ‏ تھیں پیش نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

اسلام سے پہلے مادی طاقت و قوت، دولت و وجاہت اور نسلی و قومی برتری کی پرستش ہوتی تھی، ہر کمزور طاقتور کا اور ہر ادنی اعلیٰ کا غلام تھا، اسلام نے یہ سارے امتیازات ختم کر کے حسن عمل اور حسن کردار کو عزت و شرف کا معیار قرار دیا،

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ

تم میں خدا کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے
جو سب سے زیادہ پاکباز ہے۔

آزادی و مساوات کا مسئلہ جو انسانی عظمت کا ایک اہم پہلو ہے، اسلام کی نگاہ میں اس درجہ اہم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں جو آخری خطبہ دیا تھا، اس میں انسانی مساوات

پر بھی زور دیا تھا آپ کے الفاظ یہ ہیں:

ایھا الناس ان ربکم واحد	لوگو! تمھارا پروردگار ایک ہی تمھارا باپ بھی
وان اباکم واحد کلکم لآدم وآدم	ایک ہی تم سب اولاد آدم ہو اور آدم
من تراب ان اکرمکم عند اللہ	مٹی سے بنے تھے، اللہ کے نزدیک تم میں
اتقاکم ولیس لعربی علی عجمی	سب سے معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ پاکباز ہے،
فضل الا بالتقوی	کسی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں مگر تقوی کی بنا پر۔

ایک دوسری روایت ہے جس میں تصریح کے ساتھ نسل و قومیت اور حسب و نسب پر فخر و غرور کو مٹایا گیا ہے،

ان اللہ اذھب عنکم عبیۃ	اللہ تعالی نے جاہلیت کے غرور اور آباء و
الجاھلیۃ وفخرھا بالآباء	اجداد پر فخر کو ختم کردیا، انسان یا مومن
انما ھو مومن تقی او فاجر شقی	پاکباز ہے یا بدکار شقی، تم سب اولاد
الناس کلکم بنو آدم وآدم	آدم ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔
خلق من تراب (ابوداؤد)	

یہ اعلان، آزادی و مساوات کا وہ چارٹر ہے جس نے انسانوں کو انسانی غلامی سے آزاد کرکے ملک و ملوک، نسل و قومیت، حسب و نسب، دولت و وجاہت اور ادنی و اعلی کے امتیازات مٹا کر سارے انسانوں کو ایک سطح پر کھڑا کردیا اور کوئی انسان کسی انسان کا بندہ و غلام باقی نہیں رہ گیا،

عظمت و شرف کی ذمہ داریاں لیکن اس عظمت و شرف کے ساتھ اس کی ذمہ داریاں بھی بڑی کٹھن ہیں، یہ فطری قانون ہے جس پر ساری دنیا کا عمل ہے کہ منصب جس قدر جلیل ہوتا ہے اسی قدر اس کی

ذمہ داریاں بھی عظیم اور پابندیاں بھی سخت ہوتی ہیں، صاحب منصب کی ذاتی حیثیت بہت کم باقی رہتی ہے، اس کے اعمال و افعال اور زبان تک پر پابندی عائد ہوجاتی ہے، وہ محض اپنے عہد اور منصب کے فرائض کا نقیب اور ترجمان بنجاتا ہے، اس کے خلاف ایک لفظ اپنی زبان سے نہیں نکال سکتا، چنانچہ دنیاوی حکومتوں کے سربراہ، وزراء اور سفراء وغیرہ بھی صرف اپنی حکومت کے ترجمان ہوتے ہیں، ان کی ہدایات اور پالیسی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاسکتے۔

مرد مومن کا مقام اور اس کے فرائض اسی طرح ایک مومن جو خلیفۃ اللہ فی الارض[1] اور دنیا میں احکام الہی کا مبلغ اور ترجمان ہے، خود مختار نہیں، بلکہ احکام خداوندی کا پابند ہے، اس کے خلاف ایک قدم

---

[1] انسانی عظمت و شرف میں پیدائشی طور پر سارے انسان برابر ہیں، اور خلیفۃ اللہ فی الارض بننے کی صلاحیت تمام انسانوں میں مشترک ہے، لیکن اس کا وعدہ انہی انسانوں کیلئے ہے جنھوں نے اپنے ایمان و عمل سے انسانی شرف و عظمت کو قائم رکھا ہے اور اپنے کردار سے خلیفۃ اللہ فی الارض کے مستحق ہونے کا ثبوت دیا ہے، چنانچہ کلام مجید میں ارشاد ہے

ان الارض یرثھا عبادی الصالحون	میرے نیک بندے زمین کی بادشاہت کے وارث
وعد اللہ الذین امنوا وعملوا الصالحات	ہوں گے، تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور
لیستخلفنکم فی الارض کما استخلف	نیک عمل بھی کرتے رہے، ان کو وہ زمین کی
الذین من قبلکم	خلافت ضرور عطا کرے گا۔

یہی وہ مرد مومن ہے جس کو دنیا میں سربلندی کی بشارت دی گئی ہے،

ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم	(اور عارضی حالات سے) تم ہمت نہ ہارو اور غمزدہ
الاعلون ان کنتم مومنین	نہ ہو اگر تم سچے مومن ہو تو تمھارا بول بالا ہوگا۔

غیر مومن اور بدکار خدا کا باغی ہے، وہ کس طرح نیابت الہی کا فرض انجام دے سکتا ہے، اس لیے وہ اس منصب جلیل کا اہل نہیں۔

نہیں اٹھاسکتا، اسلام کے معنی ہی اپنے کو مکمل طور پر خدا کے حوالے کر دینے کے ہیں، اس کی بڑی اچھی تمثیل حدیثوں میں ہے کہ "دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے جنت ہے۔" اس حدیث کے مختلف معنی بیان کیے جاتے ہیں، لیکن سب سے دلنشین معنی یہ ہیں کہ قید کی زندگی میں انسان کو اپنے افعال کا مختار نہیں بلکہ دوسرے کا پابند ہو کر رہنا پڑتا ہے، اور ایک مومن اپنے ہر عمل میں احکام الٰہی کا پابند ہے، اس لیے دنیا گویا اس کے لیے قید خانہ ہے، اس کے مقابلہ میں جنت میں کوئی پابندی نہ ہوگی، ہر شخص اپنے عمل میں خود مختار ہوگا، اور کافر بھی احکام الٰہی کا پابند نہیں ہوتا، بلکہ اپنے افعال و اعمال میں آزاد ہوتا ہے، اس لیے دنیا اس کے لیے جنت ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہمیت

ایک مومن نہ صرف خود احکام الٰہی کا پابند ہے، بلکہ وہ دنیا میں اس کا مبلغ بنا کر بھیجا گیا ہے، وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی عظیم ذمہ داری سے گرانبار ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	لوگوں کی رہنمائی کے لیے جس قدر امتیں
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ	پیدا کی گئیں ان میں تم سب سے بہتر ہو کہ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ	اچھے کام کرنے کا حکم دیتے ہو اور برے
(آل عمران)	کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو،

ایک دوسری آیت میں ہے:

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى	اور تم میں ایک جماعت ایسی رہنی چاہیے
الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ	جو لوگوں کو نیک کاموں کی طرف بلائیں،
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ	اچھی باتوں کا حکم دیں اور بری باتوں سے
هُمُ الْمُفْلِحُونَ	منع کریں۔

حدیثوں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی یہاں تک تاکید ہے۔

والذی نفسی بیدہ لتامرن	اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے
بالمعروف ولتنهون عن المنکر	تم لوگ اچھے کام کرنے کا حکم دیتے رہو اور برے
او لیوشکن اللہ ان یبعث علیکم	کاموں سے روکتے رہو، ورنہ خدا اپنا عذاب
عذابا من عندہ ثم تدعوا	تم پر نازل کرے گا، اور پھر تم دعا کرو گے
ولا یستجاب لکم (ترمذی)	اور تمھاری دعا قبول نہ کی جائے گی

ایک دوسری روایت میں ہے

قال من رای منکم منکرا فلیغیر	تم میں سے جو شخص کوئی بری بات دیکھے تو اس کو
بیدہ فان لم یستطع فبلسانہ	چاہیے کہ اپنی قوت سے مٹائے، اگر اسکی
فان لم یستطع فبقلبہ وذلک	طاقت نہ ہو تو زبان سے کہکر مٹائے، اگر
اضعف الایمان (مسلم)	اسکی طاقت بھی نہ ہو تو کم سے کم دل سے
	اسکو برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے

نیکی اور خیر کی تبلیغ اور اس کے قیام و نفاذ اور بدی اور شر کے انسداد پر دنیا کا سارا نظام قائم ہے، اس کے بغیر سارا کارخانہ عالم درہم برہم ہو جائے گا، انبیاء علیہم السلام بھی اسی کی تبلیغ اور قیام کے لیے مبعوث ہوئے تھے، اور دنیاوی حکومتوں کے قوانین کا مقصد و منشا بھی درحقیقت خیر کا قیام اور شر کا انسداد ہے، ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ دنیاوی قانون کا دائرہ انسانوں کے مادی معاملات تک محدود ہوتا ہے، ان کو انسانوں کے اخلاقی اور روحانی معاملات سے صرف اسی حد تک علاقہ رہتا ہے جس حد تک عوام کے نفع و نقصان سے ان کا تعلق ہوتا ہے، لیکن احکام الٰہی اور حکومت الٰہیہ کا دائرہ انسانوں کے دینی و دنیاوی اور مادی و روحانی جملہ ضروریات تک وسیع ہے، اس لیے خلیفۃ اللہ فی الارض کی ذمہ داریاں دنیاوی حکومتوں سے زیادہ اہم ہیں۔

وہ انسانوں کے جملہ معاملات میں خواہ وہ دینی ہوں یا دنیاوی، اخلاقی ہوں یا روحانی، احکام الٰہی کا ترجمان و مبلغ بھی ہے، اور اس کے قیام و نفاذ کا بھی ذمہ دار ہے، اس اعتبار سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر مومن کا فریضہ ہے۔

اس راہ کے شدائد درحقیقت یہی وہ بار امانت ہے جس کے اٹھانے کی ہمت زمین و آسمان نہ کر سکے اور انسان کی ہمت مردانہ نے ان کو اٹھا لیا۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَی السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَیْنَ
اَنْ یَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا
وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ
ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (احزاب-۹)

اور ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمینوں
اور پہاڑوں پر پیش کی تو سب اس بار امانت
کو اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے
اور انسان نے اس کو اٹھا لیا، بیشک وہ
اپنے حق میں بڑا ظالم اور نادان ہے۔

ع آغاز کا دیوانہ انجام سے غافل تھا

کہ اس بار امانت کے اٹھانے کے معنی خدا کی راہ میں جان و مال کی بازی لگا دینے کے ہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ
اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ
لَهُمُ الْجَنَّةَ (توبہ)

اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور
ان کا مال خرید لیا ہے کہ اس کے بدلے میں
ان کو جنت ملے گی۔

اس راہ میں طرح طرح کے شدائد سے آزمائش ہوتی ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ
وَنَقْصٍ مِنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ
وَالثَّمَرَاتِ (بقرہ ۱۹)

اور ہم تم کو تھوڑے سے خوف سے اور
بھوک سے اور جان و مال اور پیداوار کی
کمی سے آزمائیں گے۔

چنانچہ بڑے بڑے اولو العزم انبیاء علیہم السلام کو ایسی سخت آزمائشوں سے گذرنا پڑا کہ وہ بھی بعض اوقات تقاضائے بشری سے گھبرا اٹھے: مسلمانوں کو مخاطب کر کے ارشاد ہوتا ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ
وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ
مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ
وَزُلْزِلُوْا حَتّٰی يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ
وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰی نَصْرُ اللّٰهِ
اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ
(بقرہ - ۲۶)

کیا تم ایسا خیال کرتے ہو کہ بس جنت میں
داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ تم کو ان لوگوں کے
جیسے حالات نہیں پیش آئے جو تم سے پہلے
گذر چکے ہیں کہ ان کو سختیاں بھی پہنچیں اور
تکلیفیں بھی پہنچیں اور جھنجھوڑے بھی گئے
یہاں تک کہ پیغمبر اور جو ایمان والے ان کے
ساتھ تھے پکار اٹھے کہ خدا کی مدد کب آئیگی
(اور ہم نے ان کو تسلی دی) کہ بس خدا کی
مدد قریب آگئی۔

اس کے نتائج خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور دوسرے ارباب عزیمت مومنوں کو کیسے کیسے صبر آزما حالات سے گذرنا پڑا مگر ان کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی، ان کی قربانیوں اور جانکاہیوں نے خفتہ انسانیت کو بیدار، مری ہوئی قوموں کو زندہ اور گم کردہ راہ قافلوں کو راہ راست پر لگا دیا، اور ایک ایسی امت پیدا کر دی جو اپنے اعمال و اخلاق میں دنیا کے لیے نمونہ تھی، اور خدا کا یہ وعدہ پورا ہو کر رہا

"میرے نیک بندے زمین کی بادشاہت کے وارث ہوں گے، تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل بھی کرتے رہے، ان کو روئے زمین کی خلافت (حکومت) ضرور عطا کرے گا جس طرح ان لوگوں کو خلافت دی جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں۔

اور مسلمانوں کو روئے زمین کی سب سے زیادہ وسیع اور طاقتور سلطنت عطا کی گئی جس کا ایک سرا سندھ تھا اور دوسرا فرانس کی سرحد سے ملتا تھا، اس زمانہ میں انھوں نے اقوام عالم کی قیادت اور رہنمائی کی اور ان کے ذریعے دنیا میں دین و ایمان، علم و عرفان اور اخلاق و روحانیت، اور تہذیب و ثقافت کی روشنی پھیلی، وہ جس صحرا میں نکل گئے اس کو گلشن بنا دیا، دوسری قومیں ان کے علوم اور تہذیب فخریہ سیکھتیں اور اختیار کرتی تھیں، مگر یہ اسی وقت تک تھا جب تک وہ پیغام الٰہی کے علمبردار رہے، اور اعلاء کلمۃ اللہ ان کا شعار رہا، جب سے اس کا سر رشتہ انکے ہاتھ سے چھوٹا، اس وقت سے وہ خود ان قوموں کی غلامی میں مبتلا ہو گئے جن کے وہ حاکم و رہنما اور مربی و معلم تھے، اور آج تک ان کی ذہنی غلامی میں مبتلا ہیں، افراد سے لیکر جماعتیں اور حکومتیں تک مغربی تہذیب کے سحر میں گرفتار اور اس کے نقش قدم پر گامزن ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خدا کی خوشنودی اور نصرت نے بھی ان سے منہ پھیر لیا اور وہ اس قوت سے محروم ہو گئے جس پر ان کی توانائی کا دار و مدار تھا۔

مسلمانوں کا زوال اور اس کے اسباب آج دنیا میں مسلمانوں کی تعداد پچاس ساٹھ کروڑ کے درمیان ہے، اور ان کی بیس پچیس حکومتیں ہیں، اس کے باوجود ان کی کوئی آواز نہیں، اور وہ ایک پس ماندہ قوم بنکر رہ گئے ہیں، ان کی حکومتوں تک میں کوئی جان باقی نہیں ہے، چنانچہ پوری عرب دنیا ملکر بھی اسلام اور مسلمانوں کی سب سے بڑی دشمن اسرائیل کی چھوٹی سی ریاست کا مقابلہ نہیں کر سکتی، ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ سے اوپر ہے، لیکن ان کی کوئی حیثیت نہیں، اس لیے کہ وہ زندگی کی اس قوت سے محروم ہیں جس کے بغیر انسانوں کی حیثیت جانوروں کے گلے اور خس و خاشاک سے زیادہ نہیں، جس کو ایک معمولی چنگاری جلا کر خاکستر کر سکتی ہے،

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے   مسلماں نہیں خاک کا ڈھیر ہے

ایک مغالطہ کا ازالہ مغربی قوموں کی تقلید اور اس کے فوائد کی سب سے بڑی دلیل یہ دیجاتی ہے کہ وہ مذہبی قیود سے آزادی اور مادی نظام حیات ہی کی بدولت بام عروج پر پہنچی ہیں، اگر مذہب ترقی میں مانع نہ ہوتا تو مسلمان جو مغربی قوموں کے مقابلہ میں زیادہ مذہبی ہیں، کیوں پستی اور تنزل کا شکار ہوتے، لیکن یہ سراسر مغالطہ ہے، نہ مغربی قوموں نے محض مذہبی آزادی اور مادی تصور حیات کے بدولت ترقی کی اور نہ مسلمان مذہب کی پابندی سے تنزل میں مبتلا ہیں، اولاً یہی قابل بحث ہے کہ جس مادی ترقی کو دلیل میں پیش کیا جاتا ہے کیا وہ واقعی انسانیت کی صحیح اور متوازن ترقی ہے؟ اور اس سے انسانیت کی ضروریات اور اس کے مطالبات پورے ہو جاتے ہیں، اور کیا واقعی مسلمان مذہب کے پابند ہیں؟

مغربی قوموں کی ترقی کے حقیقی اسباب مغربی قوموں کی ترقی کا سبب محض مذہب سے آزادی اور مادی تصور حیات نہیں، بلکہ قوموں کی موت و حیات اور ترقی و تنزل کے اصولوں پر ان کا عمل ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے بھی کچھ اصول مقرر کیے ہیں، جو قوم بھی ان پر عمل کرے گی وہ ضرور دنیا میں سربلندی حاصل کریگی، خواہ وہ مومن ہو یا کافر اور جو قوم ان کو چھوڑے گی خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو تنزل کا شکار ہوگی، فطرت کے قوانین سب کے لیے یکساں ہیں، ان میں مومن و کافر کی تخصیص نہیں، جس طرح صحت اور تندرستی کے کچھ اصول و قوانین ہیں، جو بھی ان کی پابندی کرے گا وہ بیماری سے محفوظ اور تندرست رہے گا، اور جو خلاف ورزی کرے گا وہ امراض کا شکار ہوگا اور ہلاکت تک نوبت پہنچ جائے گی، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک کافر صحت کے اصولوں کی پابندی کے باوجود محض اپنے کفر کی بنا پر تندرست نہ رہے، اور ایک مومن ان اصولوں کی خلاف ورزی کے باوجود محض اسلام سے انتساب کی بنا پر امراض و ہلاکت سے محفوظ رہے، یہی حال قوموں کی صحت اور توانائی اور بیماری اور ہلاکت کے اصولوں کا ہے،

قوموں کی موت وحیات اور ترقی وتنزل کے عناصر

قوموں کی ترقی اور تنزل اور موت وحیات کے بہت سے عناصر ہیں، مثلاً نصب العین کا تعین، ان کی صحت پر ایمان اور یقین واثق، اس کے حصول کی جد وجہد، اس کے لیے جانبازی وجانفروشی، قومی وحدت، اجتماعی مفاد کے لیے ایثار و قربانی ہمدردی و مواسات وغیرہ، جن قوموں میں بھی یہ اوصاف ہوں گے وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گی، خواہ وہ مومن ہوں یا کافر، اگر اس معیار سے مسلمانوں اور مغربی قوموں کا موازنہ کیا جائے تو مسلمان ان کے مقابلہ میں ہیچ نظر آئیں گے، مغربی قومیں اپنے بعض اخلاقی عیوب اور مادی تصورات کے باوجود ان اصولوں پر سختی سے عامل ہیں، انھوں نے اپنی زندگی کا نصب العین مادی ترقی، سیاسی سربلندی اور دنیاوی عیش وتنعم کو بنالیا ہے، اور اس کے لیے ان کو مال کیا جان تک دیدینے میں باک نہیں ہوتا، یورپ کے بڑے بڑے فضلاء اور سائنٹسٹ اس راہ میں اپنی جانیں قربان کرچکے ہیں، جب قومی اور اجتماعی مفاد کا سوال آتا ہے تو ہر فرد اپنا پورا خاندان قومی مفاد کے لیے لٹادیتا ہے، سلاطین اور امراء اپنے لڑکوں کو بلا تامل میدان جنگ میں بھیجدیتے ہیں، وہ مادی ترقی اور محدود قومی مفاد کے لیے جتنی قربانیاں کرتے ہیں، آج کے مسلمان اپنے دین وملت کے لیے اتنی قربانی نہیں کرسکتے، انھوں نے اپنی زندگی کے لیے جو اصول بنالیے ہیں ان پر سختی سے ان کا عمل ہے، اور ان کی پابندی ان کی فطرت میں داخل ہوگئی ہے، اس لیے ان کی ترقی کا سبب مذہب سے آزادی نہیں بلکہ مادی اور قومی ترقی کے اصولوں پر ان کا عمل ہے، اور یہ بھی کلیۃً صحیح نہیں ہے کہ وہ مذہب سے مطلق آزاد ہیں، اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

محض مادی ترقی انسانیت کی ترقی نہیں ہے

لیکن یہ ترقی درحقیقت انسانیت کی نہیں بلکہ صرف مادی ترقی ہے، جس سے انسانیت کے مطالبات پورے نہیں ہوتے، انسانوں کو صرف مادی سروسامان ہی کی احتیاج نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ اس کو اخلاق، روحانیت کی بھی ضرورت ہے۔

اس کے بغیر محض مادی طاقت انسان کو حیوان بنادیتی ہے، جو طاقت بھی اخلاق اور انسانیت کے اصولوں کی پابند نہ ہوگی وہ انسانیت کے لیے وبال جان بنجائے گی، اسی لیے آج مغربی قوموں کی ساری طاقتیں اور علم وسائنس کی تمام ترقیاں انسانوں کے لیے سکون وراحت کا سامان فراہم کرنے سے زیادہ اس کی ہلاکت اور تباہی وبربادی کے سامان فراہم کرنے میں صرف ہورہی ہیں، ان میں اقتدار اور سیاسی برتری کی ایک جنگ برپا ہے، ایسے ایسے اسلحے ایجاد ہورہے ہیں کہ اگر ان کے استعمال کی نوبت آگئی تو عالم انسانیت کا خاتمہ یقینی ہے، اس ہلاکت آفرینی کو دیکھکر خود یورپ کے بڑے بڑے مفکرین مضطرب ہیں اور انسانیت کے نام پر اخلاق وروحانیت اور عالمگیر انسانی اخوت وہمدردی کی صدا بلند کررہے ہیں،

اگر انسان نے فلک شگاف راکٹ ایجاد کرلیے، چاند پر پہنچکر اپنا جھنڈا گاڑدیا بلکہ اس سے بھی اونچا اڑا تو اس سے مادی طاقت کے اظہار کے سوا کیا حاصل ہوا، انسانیت کی ترقی اور اس کی صحیح خدمت تو یہ ہوتی کہ اس ترقی کے ساتھ قوموں میں خداشناسی، اخلاق فاضلہ اور انسانی ہمدردی ومواسات پیدا کیجاتی، اس کے بغیر محض مادی طاقت ایک شتر بے مہار اور مست ہاتھی ہے جو انسانیت کو کچل کر رکھ دیگی اس لیے یہ ترقی درحقیقت انسانیت ترقی نہیں بلکہ صرف مہلک مادیت کی ترقی ہے۔

کیا مسلمان مذہب کے پابند ہیں

اب دوسرے سوال کو لیجئے، کیا واقعی مسلمان مذہب کے پابند ہیں، اور انکی مذہبیت ہی ان کے تنزل اور پستی کا سبب ہے، اس میں شبہ نہیں کہ مسلمانوں میں دوسری قوموں کے مقابلہ میں مذہب کے ظاہری رسوم کی پابندی زیادہ ہے، لیکن وہ مذہب کی اصل روح یعنی اخلاص، خشیت الٰہی، رجوع الی اللہ اور اعلاء کلمۃ اللہ اور اس کے لیے ایثار وقربانی کے جذبہ سے خالی ہیں اور ان کی مذہبیت مذہب کا محض ظاہری خول ہے، اس لیے اس سے وہ نتائج کیسے نکل سکتے ہیں، جن کا خدا نے وعدہ کیا ہے، اور وہ اخلاق فاضلہ کیسے پیدا ہوسکتے ہیں جو دنیاوی سربلندی کے لیے

ضروری ہیں۔

مسلمانوں نے مذہب کے ایک اہم پہلو یعنی قوموں کے عروج و زوال اور موت و حیات کے اصولوں کو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے، اسلام محض روزہ، نماز، حج اور زکوٰۃ کا نام نہیں ہے، اور اس کے بھی کتنے مسلمان پابند ہیں، بلکہ اعلاء کلمۃ اللہ اور اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی اور شوکت و عظمت کے لیے جد و جہد ایثار و قربانی، انفاق فی سبیل اللہ، قومی وحدت، اسلامی اخوت اور اس قبیل کے دوسرے اصولوں کو بالکل فراموش کر دیا ہے، جو عبادات ہی کی طرح ضروری ہیں اور جن پر قوموں کی موت و حیات کا دارومدار ہے، بلکہ جہاد یعنی اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے لیے ہر قسم کی جانی و مالی قربانی افضل العبادات ہیں، اس جد و جہد میں سائنسی علوم کی تحصیل، اُن کی ایجادات و اختراعات، مضبوط نظام حکومت، فوجی قوت وہ تمام چیزیں داخل ہیں جو موجودہ دور میں کسی قوم کی بقا و استحکام کے لیے ضروری ہیں۔

خود قرآن مجید اس پر شاہد ہے، اور خلفاے راشدین کا اس پر عمل رہا ہے، علم و فن کا درجہ اسلام میں بہت بلند ہے، کلام مجید کی جو پہلی وحی نازل ہوئی وہ علم کی عظمت کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔

اسلام میں علم وسائنس کی اہمیت

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ

اپنے پروردگار کا نام لیکر پڑھو جس نے مخلوقات کو پیدا کیا، آدمی کو گوشت کے لوتھڑے سے بنایا، قرآن پڑھو، اور تمھارا رب بڑا کریم ہے جس نے انسان کو قلم کے ذریعہ علم سکھایا اور وہ باتیں سکھائیں جو وہ نہیں جانتا تھا۔

عالم اور غیر عالم برابر نہیں ہیں۔

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (زمر)

کیا جو لوگ جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے دونوں برابر ہیں (ایسا نہیں ہے)

بلکہ علماء اور اصحاب علم کا درجہ بلند ہے

يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ (مجادلہ)

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور جنکو علم دیا گیا ہے اللہ انکے درجے کو بلند کرے گا۔

علم ہی کی ایک قسم حکمت ہے اور حکمت کو قرآن مجید میں خیر کثیر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (بقرہ)

اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے حکمت دیتا ہے اور جس کو حکمت دیگئی اس نے بڑی دولت پائی۔

حکمت کے جو معنی بھی لیے جائیں اس میں علم و تجربہ اور عقل و دانش کی باتیں ضرور داخل ہونگی۔

دینی نقطۂ نظر سے دنیاوی علوم کی ضرورت

اس قسم کی اور بھی آیات ہیں جن سے علم و حکمت کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے، عام طور پر علم و حکمت سے مراد وحی الٰہی، علم دین اور دین کی سمجھ لیجاتی ہے، لیکن اس تخصیص کی کوئی وجہ نہیں، جب کہ اس کے الفاظ میں عموم ہے، یہ بلاشبہ صحیح ہے کہ سب سے مقدم دینی علوم اور تفقہ فی الدین ہے، اور ان کو دوسرے تمام علوم پر اولیت اور فضیلت حاصل ہے، لیکن دوسرے علوم خصوصاً ان علوم کو خارج کر دینے کی کوئی وجہ نہیں جو دین کی خدمت اور اسلام اور مسلمانوں کی شوکت و عظمت کے قیام کے لیے اس زمانہ میں ضروری ہیں، اور جن کے بغیر کوئی قوم طاقتور نہیں ہو سکتی بلکہ زندہ نہیں رہ سکتی، خود قرآن مجید کی آیات اس پر شاہد ہیں کہ دنیاوی علوم نہ صرف دنیاوی طاقت کے حصول کے لیے ضروری بلکہ عرفانِ حق کے لیے بھی مفید ہیں، مثلاً کلام مجید میں جابجا کائنات کی تخلیق، اس کے مظاہر، آسمان و زمین، چاند، سورج، پہاڑ اور سمندر، بارش اور ہوا، زمین کی روئیدگی اور انسان کی خلقت پر غور و فکر کرنے کا حکم دیا گیا ہے، ایک مومن کے عرفان کے لیے تو ان کی خلقت اور اس کے ظاہری فوائد ہی کافی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی تخلیق کا کمال، اس کی صناعیاں اور اس کے اسرار و حکم ایک محقق اور سائنٹسٹ پر زیادہ منکشف ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک ظاہر بیں کے لیے انسان کا ظاہری

حسن وجمال اللہ تعالیٰ کے کمال تخلیق کے ثبوت کے لیے کافی ہو، لیکن تشریح الاعضا کے ماہر ڈاکٹروں کو انسانی جسم کے ہر عضو میں اللہ تعالیٰ کی بے نظیر صناعی کی ایک پوری کائنات نظر آتی ہے، اسی طریقہ سے آسمان کی رفعت، سیاروں کی گردش، آفتاب کی حرارت اور روشنی، چاند کی ٹھنڈی چاندنی کو ایک عامی بھی دیکھتا اور خدا کی قدرت کو محسوس کرتا ہے، لیکن ایک ہیئت داں کو خلا کی لامحدود وسعتوں، سیاروں کے عظیم الشان نظام اور محیر العقول عجائبات میں خدا کی حقیقی عظمت اور اس کا جلال نظر آتا ہے اور اس کا دل پکار اٹھتا ہے کہ "رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ"۔ امام غزالی کا مقولہ ہے کہ جو شخص ہیئت سے واقف نہیں وہ معرفت الٰہی میں عنین ہے، اس لیے سائنسی علوم عرفان حق کے لیے بھی مفید ہیں۔

خلافت ارضی کے لیے مادی طاقت ضروری ہے

اس مسئلہ کو ایک دوسرے پہلو سے بھی دیکھیے، حکومت اور دنیاوی اقتدار کے لیے خود قرآن مجید نے علم کی طاقت اور مادی قوت کو ضروری قرار دیا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد جب بنی اسرائیل نے اس وقت کے موجود پیغمبر سے کسی کو بادشاہ بنانے کی درخواست کی تو انھوں نے طالوت کو بادشاہ مقرر کیا، بنی اسرائیل نے عذر کیا کہ ان کے پاس مال و دولت نہیں ہے، وہ ہم پر کس طرح حکومت کرسکتے ہیں، ہم ان کے مقابلہ میں حکومت کے زیادہ اہل ہیں، پیغمبر نے طالوت کے استحقاق حکومت کی یہ دلیل دی

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ	اللہ نے تم پر طالوت کو بادشاہ مقرر کیا اور
بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ	انکو علم اور جسم میں زیادہ وسعت عطا کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ حکومت و اقتدار کے لیے علم کی قوت اور جسمانی یا مادی طاقت ضروری ہے اس طرح مسلمانوں کو اپنے دشمنوں کے مقابلہ کے لیے حکم دیا گیا۔

وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن	اپنے دشمنوں کے مقابلہ کے لیے جتنی قوت
قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ	اور پلے ہوئے گھوڑے جمع کرسکتے ہو،
بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ وَآخَرِينَ	ان سے پوری طرح تیار رہو تاکہ انکے ذریعہ
مِن دُونِهِمْ (انفال)	اللہ کے اور اپنے دشمنوں اور ان کے
	علاوہ دوسروں پر اپنی دھاک بٹھا سکو

یہ آیات اس کا ثبوت ہیں کہ اس زمانہ میں حکومت کے استحکام اور دشمنوں کے مقابلہ کے لیے جس قسم کی طاقت کی ضرورت تھی اس کی تیاری کا حکم دیا گیا تھا، اور اس زمانہ میں جس قسم کی طاقت کی ضرورت ہے، اس کے لیے بھی وہی حکم ہے، اور اس میں علم و سائنس کی ایجادات، فوجی قوت اور ہر قسم کے جدید اسلحہ سب داخل ہیں، اور ان کے لیے مغربی علوم خصوصاً سائنس کی تحصیل اور اس میں کمال پیدا کرنا ضروری ہے

مسلمانوں کی علم دوستی اور خدمت علم

مسلمانوں کی تاریخ شاہد ہے کہ انھوں نے اپنے دور عروج میں دوسری قوموں کے علوم سے پورا استفادہ کیا، ان کو ترقی دی، سیکڑوں نئے علوم ایجاد کیے، اور علمی میدان میں پوری دنیا کی امامت کی، اگر اس زمانہ میں انھوں نے علم کا پایہ نہ سنبھالا ہوتا تو بہت سے پرانے علوم جن پر موجودہ علمی ترقی کی بنیاد قائم ہے، مٹ گئے ہوتے، اور آج دنیا علم کی روشنی سے محروم رہتی، انہی نے مغربی قوموں کو یونانی علوم سے آشنا کیا، طب، فلسفہ، ہیئت، ریاضیات وغیرہ میں مسلمانوں کی تصانیف کے لاطینی تراجم صدیوں تک یورپ کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل رہے، یورپ کی نشاۃ ثانیہ انہی کی رہین منت ہے، انہی علوم کی بنیاد پر اس نے علوم و فنون کا عظیم الشان قصر تعمیر کیا، اس لیے مفید علوم کی تحصیل اور ان کی خدمت و اشاعت خواہ وہ کسی قوم کے ہوں مسلمانوں کا خاص ورثہ رہا ہے، جدید علوم خصوصاً سائنسی فنون کی تحصیل نہ صرف مسلمانوں کی دنیاوی ترقی

اور سیاسی استحکام کے لیے ضروری ہیں، بلکہ ان کے بغیر اس زمانہ میں دین کی پوری خدمت بھی نہیں ہو سکتی، لیکن اس بارہ میں نقطۂ نظر بدلنے کی ضرورت ہے، علم و سائنس کی قوت کے لیے اخلاقی حدود کی پابندی ضروری ہے، اس کا مقصد انسانیت کی فلاح و سعادت ہونا چاہیے۔ محض مادی طاقت کا حصول، سیاسی اقتدار، قومی افتخار اور سربلندی اور سامان تعیش کی فراہمی نہیں اگر سائنسی علوم کو صحیح مقصد کے لیے استعمال کیا جائے تو وہ سراسر خیر ہیں، ورنہ سراپا شر، مولانا روم آج سے صدیوں پہلے کہہ گئے

علم را بر تن زنی مارے بود   علم را بر دل زنی یارے بود

اور اس کے لیے سب سے مقدم شرط خدا شناسی، خشیت الٰہی اور مواخذہ کا خوف ہے، اس کے بغیر یہ دیو قابو میں نہیں آ سکتا۔

مغربی قوموں اور مغربی تہذیب کی خوبیاں

مغربی قومیں اور ان کی تہذیب محض برائیوں کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ اس میں قابل تقلید خوبیاں بھی ہیں، ان کی مادہ پرستی کے باوجود ان میں مذہب کا بھی اثر باقی ہے، چرچ اور مشنری کا پورا نظام قائم ہے، جس پر حکومتیں کروروں روپئے صرف کرتی ہیں، مذہب کی تبلیغ، اخلاقی و روحانی تعلیم و تربیت اور رفاہ عام کے کاموں اور انسانوں کی خدمت کے سیکڑوں ادارے قائم ہیں، عیسائی مبلغین اخلاق و انسانیت کا پیکر ہوتے ہیں، اور انسانی ہمدردی اور انسانیت کی خدمت میں کوئی قوم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی، بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہت سی چیزوں میں مذہب کی روح اور اس کے مقصد پر ہم سے زیادہ انکا عمل ہے، ان کی دوسری نمایاں خوبی ان کی اصول پرستی اور ان کا ضبط و نظم ہے جو ان کی سرشت میں داخل ہے، سیاست کو چھوڑ کر جس میں وہ چنگیز و ہلاکو بنجاتے ہیں، عام زندگی میں اخلاقی اوصاف میں ان کا قدم مسلمانوں سے بہت آگے ہے۔

مغربی تہذیب کی سب سے بڑی خرابی

لیکن ان کی تہذیب کی سب سے بڑی خرابی جس نے ان کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیا ہے، ان کا مادی تصور حیات ہے، اس کی بنیاد تمام تر مادیت اور لادینیت پر ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کا اثر ہر شعبۂ زندگی میں نمایاں ہے، ایک طرف مذہب کا پورا نظام قائم ہے، دوسری طرف مادی ترقی اور عیش و تنعم مقصد زندگی بن گیا ہے، اور مغرب کی تمام قومیں عیش و تنعم کی سرمستی میں اور حکومتیں مادی ترقی، سیاسی اقتدار اور قومی برتری کے جنون میں مبتلا ہیں، سیاست میں دین و اخلاق کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہ گئی ہے، اور عیش پرستی حد سے گذر کر بد مستی تک پہنچ گئی ہے، اس کے نتائج سے خود یورپ کا سنجیدہ طبقہ اور بڑے بڑے مفکرین جن میں اخلاقی احساس باقی ہے، مضطرب ہیں اور اس کے خلاف آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔

مسلمانوں نے صرف انکی برائیوں کی تقلید کی

مسلمانوں نے مغربی تہذیب کی تقلید بھی کی تو انکی برائیوں میں، مغربی قوموں کے اچھے اوصاف اور کمالات میں ان کی تقلید کی توفیق ان کو بہت کم ہوئی، زیادہ تر ان کے عیوب اور ان کی برائیاں ان کے حصہ میں آئیں، اس لیے وہ ان دنیاوی فوائد سے بھی محروم رہے جو مغربی قوموں کے اوصاف کا نتیجہ ہیں، اس طرح دین بھی ان کے ہاتھ سے گیا اور دنیا بھی ان کو حاصل نہ ہوئی۔ مسلمانوں کے اپنے عقائد و تصورات ہیں، اپنا نظام حیات ہے اپنی تہذیب و روایات ہیں، ان کی زندگی کا خاص نصب العین اور مقصد حیات ہے، اس کے مطالبات اور ذمہ داریاں ہیں، اگر وہ ان سب کو چھوڑ کر مغربی تہذیب کے سانچے میں ڈھل کر مادی ترقی کے اوج کمال پر بھی پہنچ گئے تو وہ خیر امت کہاں باقی رہے، جن کو نیابت الٰہی اور اقوام عالم کی ہدایت و رہنمائی کا منصب سپرد کیا گیا تھا، اس کے بجائے وہ خود انہی کی برائیوں میں مبتلا ہو کر دوسری مادہ پرست قوموں کی طرح ایک قوم بن گئے، جن کی دنیا میں کمی نہیں ہے،

مسلمانوں کا منصب اور اس کی ذمہ داری

ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ آج پوری دنیا ہدایت الٰہی کو فراموش اور انسانیت کا اصل مقام کھو چکی ہے، ہر قوم مادیت کے سیلاب میں غرق اور مادی ترقی کے جنون میں مبتلا ہے، مسلمان بھی اسی سیلاب میں بہے چلے جارہے ہیں، حالانکہ وہ خیر امت ہیں، جن کو اقوام عالم کی ہدایت کا منصب سپرد کیا گیا تھا،

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	لوگوں کی رہنمائی کے لیے جسقدر امتیں
تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ	پیدا کی گئیں ان میں تم سب سے بہتر ہو کہ
عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ	اچھے کام کرنے کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں
(آل عمران)	سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو،

وہ اس منصب کو فراموش کرکے "او خویشتن گم است کرا رہبری کند" کا مصداق بن گئے ہیں، لیکن اب بھی من حیث القوم انکا تصور حیات نہیں بدلا ہے، اور ان کی ہدایت و رہنمائی کا سرچشمہ قرآن مجید اپنی اصل شکل میں موجود ہے، اس لیے اس بجھے ہوئے خاکستر میں بھی ابھی چنگاریاں دبی ہوئی ہیں، اس لیے آج بھی ان پر حق کا پیغام پہنچانے کی سب سے زیادہ ذمہ داری ہے، اس کیلئے ضروری ہے کہ پہلے وہ اپنے عمل سے خیر امت ہونے کا ثبوت دیں اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ ان کے دلوں میں ایمان کی حرارت، ان کے ہاتھوں میں ہدایت الٰہی کی مشعل، ان کے اعمال و اخلاق میں اسلام کی تصویر، ان کی نگاہ میں حقیقت بینی اور ان کے بازوؤں میں علم و سائنس کی طاقت ہو، اس وقت دنیا ان کی طرف توجہ کرنے اور ان کی باتیں سننے پر مجبور ہوگی، ورنہ محض کھوکھلی نقالی سے خس وخاشاک کی طرح بہ جائیں گے اور ان کی داستان تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں،

ہندوستان کے مسلمانوں کی مشکلات کا حل

ہندوستان کے مسلمانوں کو مغرب کی مادیت اور لادینیت کے علاوہ ایک بڑا خطرہ اکثریت میں ضم ہو جانے یا کم سے کم انکی تہذیب کے رنگ میں

رنگ جانے کا ہے، گو ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے، اور مسلمانوں کو بھی دستور میں وہی حقوق حاصل ہیں جو دوسری قوموں کے ہیں لیکن جمہوریت میں اقتدار ہمیشہ اکثریت کے ہاتھوں میں رہتا ہے، اور اسکی فطرت جارحانہ ہوتی ہے، ہر اکثریت اقلیت کو اپنے میں ضم یا کم سے کم اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتی ہے، جس کی کوشش ہندوستان میں بھی جاری ہے، اس سے بچنے کی صرف یہی صورت ہے کہ وہ اپنے دلوں میں ایمان کی حرارت اور عمل میں اسلامی کردار پیدا کریں، ایک طرف ان کے ایمان میں اتنا رسوخ اور دین میں اس قدر صلابت ہو کہ وہ کسی ایسے اثر کو قبول نہ کریں جو انکے مذہب اور انکی تہذیب و روایات کے خلاف ہو، دوسری طرف اپنے اعمال و اخلاق سے دلوں کو تسخیر کریں، اور ہندوستان کی تعمیر میں ایسا موثر حصہ لیں کہ دوسری قومیں انکی اہمیت ماننے پر مجبور ہوجائیں۔

ہندوستان کو مسلمانوں نے محض تلوار کے ذریعہ فتح نہیں کیا تھا، ورنہ اتنی طویل مدت تک انکی حکومت قائم نہیں رہ سکتی تھی، بلکہ انھوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنالیا اور ہندوستانیوں کے دلوں پر اپنے عدل، مساوات اور ملک کی محبت و خدمت کا سکہ جمایا اور اپنی ساری دماغی و ذہنی صلاحیتیں ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں صرف کردیں، مختلف ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہندوستان کو جو ہمیشہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے، متحد ملک اور علم و فن، تہذیب تمدن، ہر لحاظ سے اس صحرا کو گلشن بنادیا، اسلام کی تازہ دم قوت نے ہندوستان کی مردہ رگوں میں ایک نئی روح پھونکی، اس کو توحید خالص سے آشنا کیا، انسانی مساوات کا سبق دیا، بوسیدہ رسوم و روایات اور اوہام و خرافات سے آزاد کرکے حقیقت شناس بنایا، اسلام کے اثر سے ہندو مذہب اور ہندو معاشرہ میں تجدید و اصلاح ہوئی، مسلمانوں نے ہندوستانی علوم سے جسقدر استفادہ کیا اس سے زیادہ انکی خدمت کی، ان کو پنڈتوں کے سینوں اور ہندوستان کی چہار دیواری سے نکال کر دنیا میں ان کا تعارف کرایا، نئے علوم سکھائے، ہر شعبۂ زندگی میں نفاست اور ایک ایسی مشترک تہذیب

پیدا کی جو اپنے حسن و لطافت اور خوبی و پاکیزگی میں مشرق کی تہذیبوں میں امتیازی درجہ رکھتی ہے، مسلمانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ اسلام میں آج بھی رہنمائی کی طاقت ہے، اور وہ دنیا کو بہت کچھ دے سکتا ہے، ان کا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے، مگر آج اس کے وہ نتائج نہیں نکلتے جو اس سے پہلے نکل چکے ہیں، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ حاملین اسلام خود اسلام کے محاسن سے تہی دامن ہو چکے ہیں، اس لیے وہ دوسروں پر کیا اثر انداز ہو سکتے ہیں، ان کے اسلاف اپنے عمل سے اسلام کی تصویر پیش کرتے تھے، اس کو دیکھکر دوسری قومیں اس کی طرف کھنچی پہنچتی تھیں، اگر سلاطین تلوار سے ملک کو فتح کرتے تو اپنے عدل و مساوات سے اس کو مضبوط کرتے تھے، مبلغین اسلام اور صوفیائے کرام اپنے اخلاق و کردار سے دلوں کو تسخیر کرتے تھے، مختلف اصناف کے اصحاب علم و کمال اپنے علوم و کمالات اور اپنی تخلیقی قوت اور تعمیری صلاحیتوں سے ملک کو سنوارتے تھے، اس لیے مفتوحہ قومیں ان کی قابلیت اور ضرورت ماننے پر مجبور ہو جاتی تھیں، اگر آج بھی مسلمان اس کا عملی نمونہ پیش کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کے وہی نتائج نہ نکلیں جو اس سے پہلے نکل چکے ہیں، ورنہ محض زبانی دعویٰ دوسروں کو متاثر نہیں کر سکتا۔

اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ اگر مسلمانوں میں دینی صلابت و پختگی نہ ہوگی تو وہ رفتہ رفتہ اکثریت میں ضم ہو جائیں گے، اور اگر وہ ہندوستان میں اجنبی بن کر رہے، اپنے عمل و کردار سے دلوں کو مائل نہ کیا، اور ہندوستان کی تعمیر و ترقی میں حصہ نہ لیا تو ملک کا اعتماد حاصل نہ کر سکیں گے اور احساس کمتری کا شکار ہو کر پسماندہ قوم بن کر رہ جائیں گے۔

ہندوستان میں فارسی کا مطالعہ اور اس کا مستقبل

از جناب ڈاکٹر سید امیر حسن صاحب عابدی، دہلی یونیورسٹی

(یہ مقالہ دارالمصنفین کی گولڈن جبلی کیلیے لکھا گیا تھا)

اگرچہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد عربی اور فارسی دونوں نے اس ملک میں جگہ لی، مگر ان زبانوں کے مصرف الگ الگ رہے ہیں۔ مذہبی تعلیم و تدریس اور دینی علوم کیلیے زیادہ تر عربی سے کام لیا گیا۔ اور ہندوستان کی ملی جلی تہذیب کے ارتقاء میں جن زبانوں کو سب سے زیادہ دخل ہے، ان میں سے ایک فارسی بھی ہے، جو سینکڑوں برس تک اس ملک کی سرکاری زبان رہی ہے، اور بغیر تفریق مذہب و ملت سب نے اس کو اپنایا، چنانچہ اس دور کی تاریخ کا مطالعہ بغیر فارسی ماخذوں کے ناممکن ہے، اس طویل اور صدیوں کی مدت میں فارسی زبان و ادب نے ہندوستان میں جو ترقی کی اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ ایرانی محققین نے فارسی ادب کو جن تین سبکوں میں تقسیم کیا ہے، ان میں سے ایک کا نام سبک ہندی ہے۔

شعر، نثر، تاریخ، تذکرہ، انشاء، سلوک، منطق، فلسفہ، اخلاق، سیاست، طب، قصص، ترجمہ، تفسیر، جغرافیہ، قواعد، لغت، بلاغت، عروض و قافیہ، ریاضی، حدیث، کلام، فقہ، قرأت و تجوید، سفرنامہ، ملفوظات، ہیئت، مناظرہ، فتاویٰ، زیج، ہندسہ، معادن، موسیقی، علم الحیوان، کیمیا، نجوم، رمل، جفر، شعبدہ بازی و طلسمات، ادعیہ، اسامی کتب، تیراندازی، صید، شروع، فال، شطرنج، گنجفہ، خطاطی، تعبیر الرویا، صنعت و حرفت،

طباخی، مواعظ، نحو، کشکول، قانون و دستور العمل، فرامین، کتبہ جات، آداب الحرب وغیرہ فنون میں ہندوستان میں جس قدر کتابیں اور رسالے فارسی میں لکھے گئے، ان کا شمار کرنا اور ان کی فہرست بنانا مشکل ہے، ان میں سے جو کتابیں چھپ گئی ہیں ان کا بھی احصا نہیں کیا جاسکتا، اور اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ ایران کے مقابلہ میں یہاں فارسی کتابیں زیادہ شائع ہوئی ہیں، تو غالباً غلط نہ ہوگا۔

گذشتہ زمانہ میں فارسی زبان و ادب میں جو کچھ کام انجام پایا، اس میں ہمارے تخلیقی آرٹ کو بہت زیادہ دخل ہے، اب ہندوستان میں فارسی کے مستقبل کا سوال ہو، اس میں تحقیق و انتقاد کو سب سے زیادہ جگہ ملنی چاہیے، اس دور کا آغاز علامہ شبلی سے ہوتا ہے، ان ہی جیسی ہستیوں کے لیے حافظ نے کہا ہے

بر سر تربت ما چوں گذری ہمت خواہ

کہ زیارت گہ ارباب جہاں خواہد بود

اس سرزمین کو فخر ہے کہ اس نے علامہ شبلی جیسی شخصیت کو جنم دے کر صرف ہندوستان کے ادب کو دولت مند نہیں بنایا، بلکہ دوسرے ملکوں کو بھی اس نے استفادہ کا موقع دیا، فارسی کا کونسا ایسا عالم ہوگا جو اس بلند ہستی کو نظر انداز کرسکے اور اس سے واقف نہ ہو، فارسی ادبیات میں نہ صرف ہندوستان بلکہ اس سے باہر ایران، افغانستان، تاجکستان، وغیرہ کے لوگ اور یورپ کے مستشرقین تک ان کے آثار سے برابر استفادہ کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے، اور کوئی فارسی ادب پر کام کرنے والا انکی تصانیف سے مستغنی نہیں ہوسکتا،

ایران میں شعر العجم کی پانچوں جلدوں کا فارسی ترجمہ شائع ہوچکا ہے، سب سے پہلے چوتھی جلد شائع ہوئی اور سب سے آخر میں تیسری، اس وقت میں خود وہاں موجود تھا اور مجھے

فخر ہے کہ گو میں علامہ شبلی کی زیارت نہ کرسکا، مگر ان کی کتابوں کے مترجم سید محمد تقی فخر داعی گیلانی سے مل چکا ہوں جن کی عمر ۱۹۵۵ء میں اسی برس کے قریب تھی، فخر داعی تیسری جلد کے دیباچہ میں فرماتے ہیں: "چونکہ میں اس ترجمہ کے وقت درد کمر اور وجع مفاصل میں مبتلا تھا، اس لیے اس کام میں کافی زحمت اٹھانی پڑی"۔ استاد سعید نفیسی اس جلد کے مقدمہ میں لکھتے ہیں: "اس مفید اور پر مغز کتاب کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ پہلی کتاب ہے جسے ایک دانشمند اور روشن بین انسان نے ادبیات فارسی جیسے لافانی خزانہ کے قیمتی موتیوں کے تجزیہ اور تحلیل میں لکھا ہے اور "الفضل للمتقدم" کی بنا پر شبلی کا نام ہمیشہ باقی رہے گا۔ اس سے قبل افغانستان میں بھی شعر العجم کی جلدوں کے ترجمے ہوئے تھے، مگر یہ ترجمہ ایرانیوں کے ذوق کے موافق نہ تھا"۔

چونکہ میں بھی علامہ شبلی کے وطن کا ایک حقیر ذرہ ہوں، اس لیے مجھے اس بلند شخصیت سے جذباتی لگاؤ بھی ہے لیکن میرے جیسے انسانوں کا مطالعہ، جن کا نقطۂ نظر محدود ہے، حضرت شبلی کے مرتبہ کو اچھی طرح اجاگر نہیں کرسکتا، کیونکہ وہ ہمہ گیر شخصیت کے حامل تھے، اگر مختلف مذاق کے لوگ ملکر ان کا مطالعہ کریں تو شاید اس کا احاطہ کرسکیں، ہمیں چاہیے کہ علامہ شبلی کے نقش قدم پر چل کر اپنی دیرینہ روایات اور ادبیات کا گہرا مطالعہ کریں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ فارسی کی تمام مطبوعہ کتابوں اور رسالوں کی مکمل فہرست بنائی جائے اور ان میں سے اہم چیزوں کو پھر سے اڈیٹ کرکے شائع کیا جائے۔ مطبوعہ کتابوں کے علاوہ ہندوستان میں اور اس سے باہر فارسی کی بیشمار اہم قلمی کتابیں جو اب تک منظر عام پر نہ آسکیں، اور نفائس المآثر، مجمع النفائس، نظم گزیدہ، باغ معانی، گلدستۂ معانی، ریاض الشعراء، ریاض الافکار، ہمیشہ بہار، نشتر عشق،

طبقات شاہجہانی، جہانگیر نامۂ طالب آملی، پنجاکھیانہ، سیر المنازل، فتحنامۂ نور جہاں بیگم، رزم نامۂ حسرت، حکایت پادشاہاں، شاہجہاں نامۂ امین قزوینی، یحییٰ کاشی، عنایت خاں آشنا، ابو طالب کلیم، جلال الدین طباطبائی، قدسی مشہدی، چار چمن برہمن، جنگ اسلام خاں، آثار شاہجہانی، شش فتح کانگڑہ، تاریخ شاہ شجاع، عرفات عاشقین، خلاصۃ الاشعار، خلاصۃ الکلام، تذکرۃ الشعراء، تذکرۂ کاتب، تکملۃ الشعراء، سفینۂ عشرت، صحف ابراہیم، مخزن الغرائب، ید بیضا اور صبح صادق جیسی اہم کتابیں اور تذکرے ابھی تک چند قلمی نسخوں تک محدود ہیں، جن تک عام طور سے لوگوں کی رسائی نہیں ہوتی، ضرورت ہے کہ یہ ماخذ اڈیٹ کرکے شائع کیے جائیں، تاکہ محققین تک آسانی سے پہنچ سکیں،

ہمارے ملک میں بکثرت پبلک اور شخصی کتبخانے ہیں جن میں سے اکثر کتب خانوں کو عام طور سے لوگ نہیں جانتے اور نہ ان تک آسانی سے ان کی رسائی ہوتی ہے، مثلاً مہاراجہ بنارس کا کتب خانہ، بنارس یونیورسٹی کا سر پرام کلکشن، لکھنؤ میں آغا ابو صاحب اور نقی صاحب کے کتب خانے، لکھنؤ کے ایک کتب خانہ کو گورنمنٹ سے ہر طرح کی امداد ملتی ہے، اور ابن حبیب بغدادی کی المنمق کا واحد قلمی نسخہ اسی کتب خانہ میں ہے، چونکہ نظام حیدرآباد کے یہاں سے اس خاندان کو وظیفہ ملتا تھا، اس لیے اس قلمی نسخہ کی نقل دائرۃ المعارف کو مل گئی تھی، مگر ابھی حال میں جب ایک صاحب دائرۃ المعارف کیجانب سے اس کتاب کو اڈیٹ کرنے کے سلسلہ میں لکھنؤ گئے تو کتب خانہ کے مالکوں نے ان کو اصل نسخہ سے مقابلہ کرنے کی اجازت نہیں دی، جو بڑا علمی اور اخلاقی جرم تھا، اس لیے حکومت کا فرض ہے کہ وہ ایسے اداروں کو مجبور کرے کہ وہ علمی کاموں میں رکاوٹ پیدا نہ کرسکیں۔

ایسے کتب خانے بھی ہیں جو مشہور ہیں، اور اس میں استفادہ کرنے والوں کو ہر طرح کی

سہولت ملتی ہے، مگر بد قسمتی سے ان کی فہرستیں ابھی تک نہیں چھپ سکیں، رضا لائبریری جیسے اہم کتب خانہ کی مکمل فہرست ابھی تک رامپور سے باہر دستیاب نہیں ہو سکتی۔

اس لیے ضرورت ہے کہ پہلے تمام رسمی اور غیر رسمی کتب خانوں کی مکمل فہرست تیار کیجائے، تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ ان سے روشناس ہوسکیں، پھر ان کی محققانہ فہرستیں مرتب کیجائیں تاکہ محققین غلطیوں کا شکار نہ ہوسکیں، ابھی الور میوزیم کی فہرست چھپی ہے، جس میں دیوان سرمد کا ذکر ہے، لیکن درحقیقت یہ سرمد کا دیوان نہیں ہے، جب میں نے ۱۹۶۱ء میں الور میوزیم کو دیکھا تھا، اس وقت بھی وہاں کی قلمی فہرست میں یہ غلطی موجود تھی، جو مطبوعہ فہرست میں منتقل ہوگئی ہے، مجھکو وہاں ایک آدمی بھی ایسا نہ ملا جو فارسی کا کیا ذکر اردو سے بھی واقف ہو، اس لیے یہ کام بھی اہم ہے، اس قسم کے خزانوں کی نگرانی ایسے لوگوں کے سپرد کی جائے جو علمی طریقہ سے ان کی نگرانی اور خود بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہوں۔

کتب خانوں کی تنظیم کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ ان تمام مخطوطات کا مطالعہ کیا جائے جو ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی تاریخ و تہذیب اور آثار قدیمہ کے مطالعہ میں مدد دے سکتے ہوں، ان کے مطالعہ سے بہت سے ایسے گوشے سامنے آئیں گے جن سے ابتک لوگ ناواقف ہیں، رفتہ رفتہ کئی نادر کتابیں تلاش سے نکل رہی ہیں۔

پنچتنترا کا تقریباً دنیا کے تمام متمدن ممالک میں بار بار ترجمہ ہو چکا ہے، اس کے تقریباً ساٹھ زبانوں میں دو سو ترجمے موجود ہیں، اور جاوا سے لیکر آئیس لینڈ تک اس کا دائرہ پھیلا ہوا ہے، علماء و محققین نے اس موضوع پر بہت کام کیا ہے، اور تقریباً تمام ترجموں کا پتہ لگایا ہے، پھر بھی ایک بیحد اہم ترجمہ ان کی نظروں سے پوشیدہ رہ گیا، ابھی حال میں اس ترجمہ کا پتہ چلا ہے جس کا نام پنچاکھیانہ ہے، اور جسے مصطفیٰ خالقداد عباسی نے شہنشاہ اکبر

کے حکم سے براہ راست سنسکرت سے ترجمہ کیا تھا، اس کا واحد قلمی نسخہ نیشنل میوزیم نئی دہلی میں موجود ہے۔ (نمبر ۶۲۰۱۰۰۵)

ہندوستان کے قرون وسطیٰ کے تاریخی اور تہذیبی مطالعہ کے لیے کچھ محدود کتابیں جنکو لوگ پہلے اصل زبان میں پڑھا کرتے تھے، لیکن اب زیادہ تر ان کے ترجموں سے کام نکالا جاتا ہے، اس سے مطالعہ کرنے والے کتاب کی اصل روح سے دور ہوتے جا رہے ہیں، ترجموں میں غلطیوں کے امکانات بھی ہوتے ہیں، جن سے غلط نتیجے نکل سکتے ہیں۔

ان کے علاوہ بیشمار ایسی کتابیں اور تذکرے ہیں، جن کا ابتک کسی زبان میں ترجمہ نہیں ہوا ہے، اور ان کے ماخذ سے عام طور پر لوگ محروم رہتے ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ اس قسم کی اہم کتابوں کا زیادہ سے زیادہ ترجمہ کیا جائے، اور ان کے متن کو معیاری طریقہ سے شائع کیا جائے اور لوگ اصل متن کے پڑھنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کریں۔

پھر یہ غلط خیال ہے کہ صرف تاریخ کی کتابوں سے مورخین کے لیے مواد مل سکتا ہے، مجھے ڈاکٹر اشرف مرحوم کا کہنا کبھی نہیں بھولتا کہ تاریخ و تہذیب کے مطالعہ کے لیے ادبیات کا مطالعہ ناگزیر ہے، اس سے بڑا مواد مل سکتا ہے۔

چنداین یا داستان مینا و لورک کو مولانا داؤد نے فیروز شاہ تغلق کے زمانہ میں ہندی میں نظم کیا تھا، اور مخدوم شیخ تقی الدین واعظ ربانی دہلی میں اس کے بعض حصوں کو منبر پر پڑھا کرتے تھے جس سے سامعین پر عجیب کیفیت طاری ہوتی تھی، اس زمانہ کے بعض علمانے اس نظم کے پڑھنے کا سبب پوچھا، تو جواب دیا کہ یہ کتاب صاحبان عشق کے وجدان اور آیاتِ قرآنی کے مطابق ہے، مولانا داؤد کی چنداین سے شیخ عبد القدوس گنگوہی اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ فارسی نظم میں اس کا ترجمہ کر دیا، بدقسمتی سے اب اس فارسی مثنوی کے صرف سات شعر لطائف قدوسی

میں محفوظ رہ گئے ہیں، عہد جہانگیری میں یہ داستان "عصمت نامہ" کے نام سے منظوم ہوئی ہے۔

اسی طرح نوعی خبوشانی کی ایک مختصر مثنوی "سوز و گداز" ہے، اس کا قصہ یہ ہے کہ ایک حسین دلھن کا شوہر بارات آتے آتے ایک کہنہ مکان کے گرنے سے مرجاتا ہے، وہ ستی ہونا چاہتی ہے، شہنشاہ اکبر کو معلوم ہوتا ہے، تو اسے بلا کر اپنے تخت پر بٹھاتا ہے، اسے رانی کا خطاب دیتا ہے، اور سوائے تخت شاہی کے دنیا کی ہر نعمت اس کے سامنے پیش کر دیتا ہے، مگر وہ کسی طرح ستی ہونے سے باز نہیں آتی، اس وقت بادشاہ شہزادہ دانیال کو حکم دیتا ہے کہ وہ خود جاکر شاہزادیوں کی طرح اس کی ستی کا انتظام کرے، اور جب وہ بغیر کرب و بیچینی کے ستی ہوجاتی ہے تو شاہزادہ روتے روتے غش کھا جاتا ہے، اکبر بھی اس واقعہ سے بیحد متاثر ہوتا ہے، اور نوعی کو بلا کر کہتا ہے کہ تم لوگ کب تک گل و بلبل کے پارینہ افسانے دہراتے رہوگے، اور اس سچے واقعہ کو نظم کرنے کا حکم دیتا ہے۔

دیوان ہجری کا ایک عمدہ نسخہ انڈیا آفس میں ہے، خواجہ ہجری ہمایوں کے ہمعصر مداح اور درباری شاعر تھے، جب اکبر تخت نشین ہوا تو ہجری نے اس نوجوان بادشاہ کو قصیدوں میں نصیحتیں کرنا شروع کیں، ایک قصیدہ میں اکبر کو غلہ کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی کی طرف متوجہ کیا ہے، ایک قصیدہ میں اس کی ژولیدہ بالوں پر متنبہ کیا ہے، اور ان کو سلیقہ سے رکھنے کی تعلیم دی ہے، دیوان ہجری میں بہت سے مطالب و جزئیات میں جو عام طور سے لوگوں کی نگاہوں سے ابتک پوشیدہ ہیں۔[1]

ہندوستان کی بہت سی داستانیں دنیا کے ادب کا حصہ بن چکی ہیں، بلرام و یوذاسف کا قصہ جو اصل میں بھگوان اور بودھی ستوا ہے، دوسری زبانوں کے علاوہ عربی اور فارسی میں بھی

---

[1] معارف- ہجری پر مضمون نگار نے ایک مستقل مضمون لکھا ہے، جو آئندہ کسی نمبر میں شائع ہوگا۔

کئی مرتبہ ترجمہ ہو چکا ہے، اس قصہ کو "اخوان الصفا" جیسی اہم کتاب میں جگہ ملی ہے، ملا محمد باقر مجلسی نے عین الحیات میں اس قصہ کو خاص طور سے بیان کیا ہے۔

فارسی نے خاص طور سے اس قسم کے قصوں کی مقبولیت میں مدد پہنچائی ہے، اور اس زبان میں ہمارے بیشمار ملکی قصے لکھے جا چکے ہیں، جن میں سے نل دمن، مہابھارت، رامائن، طوطی نامہ، سنگھاسن بتیسی، ہیر رانجھا، پدماوت، کام روپ کام لتا، سسی پنون، منوہر و مدھو مالتی، مدھا و نل وکام کندلا، سوہنی مہیوال، منکا و منوہر، مہیار و چندر بدن، چتر کرن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اسی طرح سے بہت سے ہندوستانی قصے مولانا روم کی مثنوی اور دوسری کتابوں میں ملتے ہیں، ہمارے محققین کے لیے ان میں بڑا خزانہ موجود ہے، جس سے علمی اور تہذیبی ارتقا میں گرانبہا اضافہ ہو سکتا ہے، اور بہت سے ایسے واقعات اور نکتے ہیں جو صرف ادبیات کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

شعر کی مناسبت سے فارسی شعراء کے تذکروں میں ہمیں بہت سے خطاطوں، معماروں، موسیقی والوں، جامہ بافوں، مہر کنوں، قصہ خوانوں، تاجروں، کلالوں، اتو کشوں، کلیچہ پیزوں، زعفران فروشوں، مصوروں، طبیبوں، دلالوں، سماروں، حکاکوں، پیشمازوں، خشت پیزوں، روغن گروں، زرکشوں، سپاہیوں، مدرسوں، خیاطوں، جوہریوں، نقاشوں، دلالوں، طباخوں، عطاروں، کیمیاگروں، رباب نوازوں، معماروں، نقارچیوں، بقالوں، رفوگروں، واعظوں، حلوہ فروشوں، درویشوں، تعزیہ خوانوں، سیاحوں، کاسہ گروں، منشیوں، جراحوں، حلاجوں، کمانگروں، شاہنامہ خوانوں، قیمی بافوں، حافظوں، متصدیوں، شطرنج بازوں، مہندسوں، تاجروں، ابریشم کشوں، منجموں، مفردہ نویسوں، سجادہ نشینوں، رنگریزوں، آتش پرستوں وغیرہ کے بھی حالات معلوم ہو جاتے ہیں۔ جن میں سے بعض کو اس لیے کروہ

معمولی پیشوں سے تعلق رکھتے ہیں، ہم کسی اور ماخذ سے معلوم نہیں کر سکتے۔

فارسی کی فرہنگیں اور گرامر وغیرہ زیادہ تر ہندوستان میں لکھی گئیں، اور آج ایرانیوں کو ضرورت ہوئی کہ ان کو شائع کریں۔ برہان قاطع، فرہنگ آنند راج وغیرہ ایڈٹ کر کے شائع اور ہماری چیزیں ایران کے مطبعوں میں چھپکر وہاں کے بازاروں میں فروخت کی جا رہی ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ اس قسم کی بنیادی چیزیں بھی زیادہ سے زیادہ ایڈٹ کر کے شائع کیجائیں، جن کی ہمیں اور دوسروں کو ضرورت ہے۔

فارسی کا رشتہ ہندوستان کی دوسری زبانوں سے بھی بڑا گہرا ہے۔ ان زبانوں کے مطالعہ کے لیے بھی فارسی میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت ہے، ہمارے بیشتر بڑے کلاسیکی اردو کے شعراء کا یہ اہم پہلو اپنی کمزوری اور کم علمی کی وجہ سے نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ وہ مستقل فارسی کے شاعر اور نثر نویس تھے، غالب نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

فارسی بیں تا ببیں نقشہائے رنگ رنگ

بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من است

نظیر اکبر آبادی کی علمیت میں لوگوں کو شک تھا، اور جب باطن نے کہا کہ انھوں نے فارسی میں نو رسالے لکھے اور صاحب دیوان تھے، تو لوگوں کو اس کا یقین نہیں آیا تھا، یہ رسالے اسقدر نایاب تھے کہ خود باطن سا پتہ بتا سکے۔ شہباز کو ان میں سے صرف پانچ اور نیاز صاحب کو تین رسالے مل سکے، ابھی حال میں مجھے آٹھ رسالے مل گئے ہیں، جن میں سے دو رسالے "مجمع مضامین" اور "انشای محفل" بھی ہیں جن کا نام بھی آجتک کسی کو معلوم نہ تھا۔ بہر حال اردو کا صحیح مطالعہ بغیر فارسی کے نا ممکن ہے۔

یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ موجودہ فارسی شاعری اور ادب تہی مایہ ہے، جس کی شکایت اکثر حضرات کرتے ہیں، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ نئے سبک سے مانوس نہیں ہیں، اگر ہمارے

اسلاف سعدی و حافظ، عرفی و نظیری وغیرہ سے استفادہ کر سکتے تھے، تو آج کے شعرا نیما یوشیج اور شہر یار جیسی عظیم شخصیتوں سے استفادہ کر کے اپنے سرمایہ میں اضافہ کر سکتے ہیں،

کچھ دنوں پہلے فارسی کو زیادہ تر ایک تہذیبی زبان کی حیثیت سے پڑھا جاتا تھا، اب گو اسکے طلبا، کی تعداد کم ہو گئی ہے، مگر تحقیق و انتقاد کے لحاظ سے فارسی میں جو کام ہو رہا ہے اس سے کافی ہمت افزائی ہو رہی ہے، آزادی کے بعد ہندوستان کے پرانے اداروں میں توسیع ہوتی جا رہی ہے، اور نئے نئے تحقیقی ادارے قائم ہوتے چلے جا رہے ہیں، دار المصنفین شبلی اکیڈمی، انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹیڈیز علی گڈھ، ادارۂ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ، جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹس کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر، ادارۂ مخطوطات حیدرآباد، ریسرچ اینڈ پبلک ڈویژن سرینگر وغیرہ جیسے ادارے روز بروز ترقی کرتے جا رہے ہیں، جن میں نہایت مفید کام ہو رہا ہے۔

ایران و افغانستان وغیرہ سے ہمارے روحانی اور معنوی رشتے قدیم زمانہ سے بڑے مستحکم رہے ہیں، ہمیں ان قدیم اور جدید دونوں رشتوں کو استوار کرنا ہے۔

ایران کو ہندوستانی فلسفہ سے اتنا گہرا لگاؤ رہا ہے کہ سترہویں صدی عیسوی میں وہاں کے ایک بڑے فلسفی میر ابو القاسم فندرسکی "جوگ بششت" کا فارسی ترجمہ یہاں سے لے گئے اور اس پر حاشیہ لکھا، فرہنگ درست کی اور اس کی شان میں ایک قصیدہ لکھا جس میں فرماتے ہیں

چوں ز قرآں گذشتی و اخبار

نیست کس را بدیں نمط گفتار

سمرقند و بخارا وغیرہ کو بھی ہندوستان سے بڑا تعلق رہا ہے، ابھی حال ہی میں تاجکستان میں "منتخبات ملا عبد الرحمن مشفقی" شائع ہوئی ہے۔ صدر الدین عینی، عبد الغنی میرزایف، ترسون زادہ اور دوسرے تاجکستانی محققین اور علمائے مشفقی کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے، جن کا یہ مصرع

ضرب المثل ہے:

"از بام خانۂ تا بثریا از ان تو"

مشفقی دو مرتبہ ہندوستان آئے اور جب ۱۵۷۸ء میں شہنشاہ اکبر پاک پٹن شریف شیخ فرید گنج شکر کے مزار مبارک کی زیارت کو گئے تو مشفقی کی رسائی ان تک ہوئی۔ وہاں کے محققین نے صرف اپنے یہاں کے منابع سے کام لیکر مشفقی کا تعارف کرایا ہے، ضرورت اس کی ہے کہ آئین اکبری، اکبر نامہ، طبقات اکبری، منتخب التواریخ وغیرہ کی مدد سے اس شاعر کا تعارف کرایا جائے جو ہندوستان اور تاجکستان کو جوڑنے والی ایک بڑی کڑی ہے۔

افغانستان اور ہندوستان قدیم زمانہ سے ایک رہے ہیں، اس زمانہ میں ان دونوں ملکوں کی وحدت کا پتہ اصل سنسکریت کی کتابوں کے علاوہ ان کے ترجموں سے بھی لگایا جا سکتا ہے، جوگ بششت کے فارسی ترجمہ میں جہاں بہت سی فلسفیانہ، روحانی اور اخلاقی داستانیں ہیں، وہاں ہندوستان کے راجہ سورگھو (Suragha) کا بھی قصہ ہے، جو کبھا (Kubha) یعنی کابل کے راجہ پرگھ (Pragha) پرناد (Pranada) کا دوست تھا، اور جب راجہ پرگھ کے ملک میں قحط پڑا تو یہاں کا راجہ اس سے ملنے گیا تھا، رگ وید (Rig - Vada) کے سات دریاؤں میں سے ایک کا نام کبھا (Kubha) ہے۔

مہاتما بدھ کے دو عظیم مجسمے سرخ بدھ اور خاکستری بدھ ابتک بامیان میں پرانی عظمت کا پتہ دیتے ہیں۔

بلخ کو زرتشت سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ اسی بلخ میں بدھ مذہب کا بہت بڑا مندر نو بہار (Nov Vihara) تھا۔ جہاں کابل، ہندوستان اور چین کے زائر جایا کرتے تھے۔ برمک جو اصل میں پرکھ (Pramukh) ہے، یہاں کا سب سے بڑا پجاری تھا، جس کے

خاندان کا اسلامی تہذیب کے سنوارنے میں بہت بڑا حصہ ہے۔ کنشکا اور یونانی بادشاہ مینندر (Menander) دونوں بدھ مذہب کے پیرو تھے، ایران و ہندوستان کے تصوف نے خصوصیت سے بودائی اور ہندی فلسفہ کے زیر اثر نشو و نما پائی ہے، اور یہاں کے نروانا (Nirvana) نے وہاں فنا کی شکل اختیار کی ہے، یہ تصوف مدتوں سرزمین بلخ میں پروان چڑھا جو صدیوں بدھ مذہب کا مرکز رہ چکا تھا، نیز ایرانی تصوف کے بڑے بڑے پیشوا ابو اسحٰق ابراہیم بلخی، ابو علی شقیق بلخی اور عبدالرحمٰن بلخی جیسی شخصیتیں رہی ہیں، سب سے بڑے صوفی شاعر مولانا رومی اسی خاک پاک سے تعلق رکھتے تھے۔

مغل مصوری کا اصل مسکن ہرات ہے، یہ وہ جگہ ہے جہاں خواجہ عبداللہ انصاری اور ملا عبدالرحمٰن جامی جیسی ہستیاں آرام کر رہی ہیں، غرض ان تمام گوشوں پر از سر نو کام کرنے کی ضرورت ہے، جن میں فارسی ادب کا بہت زیادہ حصہ ہے۔

اب فارسی کو صرف ایک مردہ یا کلچرل زبان کی حیثیت سے نہیں پڑھنا چاہیے، بلکہ اس لیے اس کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ وہ زندہ ملکوں کی زبان ہے، جن سے ہمارے تعلقات روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں، اس لیے اگر ایک طرف ہمیں گذشتہ تاریخ و تمدن کے مطالعہ کے لیے کلاسیکی ادب کی ضرورت ہے تو دوسری طرف ہمیں ایسی فارسی بھی سیکھنی ہے جو ہمیں ہمسایہ اور دوست ملکوں کو سمجھنے اور سمجھانے میں مدد دے سکے۔

دہلی یونیورسٹی اور دوسری یونیورسٹیوں میں بی، اے اور ایم، اے کلاسوں کے علاوہ جدید فارسی کے ایسے سرٹیفکٹ اور ڈپلوما کورس بھی کھولے گئے ہیں جن سے لوگوں کو فارسی بولنے، لکھنے اور جدید لب و لہجہ کے سمجھنے میں مدد مل سکے اور وہ ریڈیو، وزارت، سفارت وغیرہ میں بغیر غیر ملکی امداد کے اپنا کام خود چلا سکیں، آل انڈیا ریڈیو کے فارسی شعبہ میں پہلے بیرونی لوگ کام

کرتے تھے اور انھیں پر ہمارا دار و مدار تھا، مگر اب رفتہ رفتہ ہندوستانی ان کی جگہ لیتے جا رہے ہیں۔

ہندوستان اور ایران دونوں ملکوں میں فارسی کے لسانی مطالعہ کا رواج نہیں تھا، فارسی زبان دوسری زبانوں سے نکلی ہے، اس لیے فارسی کا صحیح مطالعہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ان زبانوں کا بھی مطالعہ نہ کیا جائے جنھوں نے اس زبان کے بننے اور سنورنے میں مدد دی ہے، سنسکرت اور اوستا کی ماں ایک اور زبان تھی جس کا اب وجود نہیں ہے، لیکن ان کی مشابہت اور یگانگت بتلاتی ہے کہ ان کی ماں کیسی رہی ہوگی، اسی طرح فارسی باستان، پہلوی، سغدی وغیرہ بھی اوستا اور سنسکرت سے بہت قریب اور آریائی زبانیں ہیں، اس لیے فارسی کے سائنٹفک مطالعہ کے لیے سنسکرت اور اوستا وغیرہ کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

ہماری یونیورسٹیوں میں ابتک سنسکرت اور فارسی کو ساتھ ساتھ نہیں پڑھایا جاتا حالانکہ ان دونوں کے ساتھ تعلیم دینے سے دونوں کے مطالعہ میں مدد ملے گی، پارسیوں کے یہاں اوستا اور پہلوی کا مطالعہ مذہبی حیثیت سے ضروری ہے، اس لیے بمبئی کے اطراف میں ان زبانوں کا رواج تھا، لیکن اب شمال میں بھی ان کی طرف توجہ کی جا رہی ہے، دہلی یونیورسٹی میں چند برسوں سے فارسی باستان، اوستا اور پہلوی کو بھی نصاب میں داخل اور ان کے پڑھانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ ہندوستانی محققین اس نکتہ سے غافل نہیں ہیں۔ S.K. Sen کی کتاب Old Persian اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے، مگر اب اس کی طرف باقاعدہ اور منظم طریقہ سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ادب کی تاریخی لغوی اور اصطلاحی ماہیت

از جناب وقار احمد صاحب رضوی، ایم، اے

ادب کائنات کا علم بھی ہے اور اس کا عرفان تمام بھی، وہ علم اور تہذیب کی دولت کو عام کرتا ہے، مادی اور جسمانی دنیا میں حسن کی تخلیق کرتا ہے۔ اور زندگی کی مادی جدلیت کو اقدار اعلیٰ سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ وہ فنی تجربات کی نفسیاتی تشریح کرتا ہے۔ ماورائیت کی لاشعوری توجیہ بھی ہے اور تاریخی روایت پرستی اور انفرادیت کا شعوری امتزاج بھی۔ حیاتیاتی تصور ادب کی نوعیت کو قدر و قیمت کا اندازہ عطا کرتا ہے۔ ادب تحلیل نفسی میں، جبلتوں کے سہارے عمل اور زندگی کی منزلیں طے کرتا ہے۔ وہ ماضی بعید سے بعید از فہم ابد کی طرف کسی نامعلوم راستے سے سفر کرتا ہے اور اپنے خوش آیند نغموں سے فضا کو مترنم کر دیتا ہے۔

ادب ایک ایسا عمل ترکیب ہے جو ہیئت نامیہ کے منتشر رجحانات میں ربط قائم کرتا ہے، سماجی قدروں اور انسان کی فطری خواہشوں کا تصادم فنکار کو فنی اظہار و ابلاغ کی طرف لیجاتا ہے۔ ابلاغ تخلیقی ادب کا ایک شعبہ ہے، ادب، اظہار کا ایک ڈھنگ ہے۔ وہ ادیب کے احساس کی نمایندگی بھی کرتا ہے اور حسن، لطافت اور رنگینی کو اثر اندازی کی طاقت بھی دیتا ہے، وہ فطرت کا اظہار بھی ہے اور خارجی حقائق کے شعور و ادراک کا نتیجہ بھی ہے۔

ادب نفس انسانی میں شائستگی، افکار و خیالات میں روشنی، احساسات میں نزاکت، زبان میں سلاست اور زور پیدا کرتا ہے۔ ادب کا اطلاق ان تصانیف پر بھی ہوتا ہے،

جو کسی علمی یا ادبی تحقیق کا نتیجہ ہوں۔ اور ان کتابوں پر بھی جو فکر و فن میں باہمی تاثر اور انشا و اسلوب نگارش کی بہترین مثال تصور کیجاتی ہیں۔

ادب کی ابتدائی تاریخ اور آغاز کے بارے میں کوئی نص صریح یا برہان قاطع ایسی نہیں ہے جو اس کلمے کی تاریخی حیثیت سے بحث کرے۔ یہ ایک ایسی خبر ہے جس کی مبتدا کا سراغ نہیں ملتا۔ اس لفظ کا وجود نہ سامی زبانوں میں ملتا ہے اور نہ عربوں کی جاہلی شاعری میں۔ عہد جاہلی کی تاریخوں میں کچھ اقوال ایسے ضرور ملتے ہیں، جن کے مطالعہ سے اس سلسلے میں مدد ملتی ہے۔ اس ذیل کا ایک قول تو وہ ہے جو حیرہ کے بادشاہ نعمان بن منذر نے کسریٰ کے نام ایک خط میں تحریر کیا تھا۔ اس میں لکھا تھا:

وقد اوفدت ایها الملک	اے بادشاہ! میں عرب ایک گروہ کو آپکے
رھطا من العرب لھم فضل	پاس وفد بنا کر بھیج رہا ہوں۔ جو حسب و نسب
فی احسابھم وانسابھم و	میں فضیلت رکھتے ہیں، یہ لوگ دانشور بھی
عقولھم وآدابھم[1]	اور صاحب اخلاق و آداب ہیں۔

اور دوسرا قول وہ ہے جو علقمہ بن علاثہ نے کسریٰ کے سامنے کہا:

فلیس من حضرک منا بافضل	ہم میں جو لوگ آپ کے پاس آئے ان کو
ممن عزب عنک، بل لو قست	ان لوگوں پر فضیلت حاصل نہیں ہے جو
کل رجل منھم وعلمت منھم	نہیں آئے۔ اگر آپ ان کا باہم موازنہ
ما علمنا لوجدت لہ فی آبائہ	کریں اور جتنا ہم کو ان کے بارہ میں
اندادًا واکفاءً کلھم الی الفضل	علم ہے، اتنا آپ بھی جان لیں تو آپ انکو

[1] ابن عبد ربہ: العقد الفرید ج ۱ ص ۱۲۷ (۱۲۹۳ھ)

منسوب وبالشرف السؤدد ۔۔۔ ہمارے ہم سر، ہم مرتبہ پائیں گے، وہ سب

موصوف وبالرای الفاضل ۔۔۔ صاحب فضل وشرف ہیں، ان میں سیادت ہے

والآداب معروف[1] ۔۔۔ اور وہ اعتبار رائے سے موصوف اور ادب سے آراستہ ہیں۔

یہ روایات اور اقوال ہیں، ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، ممکن ہے بعد میں وضع کیے گئے ہوں، ان روایات سے جہاں اس بات کا علم ہوتا ہے کہ جاہلی عربوں کا تصور، ادبی، سیاسی، اور اجتماعی زندگی کے متعلق کیا تھا۔ وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لفظ عرب نژاد ہے، دخیل نہیں ہے۔ اس لفظ کے عربی الاصل ہونے کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ عربی زبان میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں، جو حروف مادہ میں کلمۂ ادب سے مناسبت رکھتے ہیں اور صوتی اعتبار سے قریب المخرج اور قریب المعنی ہیں، جیسے بَدَأَ، أَبَدَ، دأبٌ۔ ان الفاظ میں جنسی معنی سب میں مشترک ہیں، کیونکہ تعلق بالشی اور ارتکابِ عادت کا مفہوم سب میں پایا جاتا ہے۔

بعض محققین (جرجی زیدان اور زیات وغیرہما) کا خیال ہے کہ یہ لفظ عربی اور دوسری سامی زبانوں میں سُمیریوں کی زبان سے آیا، جو قدیم زمانے میں جنوبی عراق میں آباد تھے۔ ان سے حملہ آوروں (سامیوں) نے اس لفظ کو اڑا لیا۔ سُمیریوں کے یہاں اس لفظ کے معنی انسان تھے۔ سامی زبانوں میں یہ لفظ ادب سے اُدم اور ادم سے آدم ہو گیا۔ لیکن عربوں نے اس لفظ کو اپنی اصلی حالت میں محفوظ رکھا۔ عرب صحرائی زندگی بسر کرتے تھے، ان کی زبان دوسری زبانوں سے خلط ملط نہیں تھی، انھوں نے اس لفظ کو آدمیت یا انسانیت کے معنی میں استعمال کیا۔ اور لازم بول کر ملزوم مراد لیا۔ اس میں

---

[1] ابن عبد ربہ: العقد الفرید ج ۱ ص ۱۲۸ (۱۲۹۳ھ)

فضائل حمیدہ اور شرافت کا مفہوم پیدا کیا، مگر یہ ایک مفروضہ ہے، حقیقت علمیہ نہیں۔

قریش کی زبان اسلام کی سیاسی، سماجی اور مذہبی زبان ہے۔ قریش کی زبان نے عرب کی دوسری زبانوں کو بھی متاثر کیا اور خود بھی ان سے متاثر ہوئی۔ قرآن مجید اسی زبان میں نازل ہوا ہے۔ ادب کے معنی تہذیب، تادیب کے لیے جاتے ہیں، یہ کلمہ سبک اور فصیح ہونے کے باوجود اگرچہ قرآن شریف میں بعینہٖ نہیں آیا ہے، لیکن ادب کا معنوی وجود قرآن میں ملتا ہے، قرآن معلم اخلاق ہے، تہذیب نفس اور اخلاق کا مبلغ ہے، اس اعتبار سے قرآن مجید میں الفاظ کی بلاغت یعنی ادب کا لفظی مفہوم اور تہذیبِ اخلاق کی تعلیم یعنی ادب کا معنوی مفہوم ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوال صحابہ سے عربی زبان میں، لفظ ادب کے وجود کی تائید ہوتی ہے، مشہور حدیث ہے:

اَدَّبنی ربّی فاَحسَنَ تادِیبی ۔۔۔ میرے پروردگار نے میری تربیت کی اور خوبی سے کی۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

ان هذا القرآن مادبة الله فی ۔۔۔ بیشک قرآن اس دنیا میں ایک خوان الٰہی ہے

الارض فتعلموا من مادبته[1] ۔۔۔ پس اس خوان سے تم لوگ استفادہ کرو۔

مادبة: ادب سے بطور تشبیہ اسم مکان ہے۔

حضرت علیؓ کا قول روایت میں آیا ہے:

اما اخوانا بنی امیة فقادة ۔۔۔ ہمارے بھائی بنی امیہ دسترخوان والے

ادبة[2] ۔۔۔ لیڈر رہیں۔

اس روایت میں اَدَبَۃٌ، آدِبٌ کی جمع ہے، جیسے کاتب کی جمع کَتَبَۃٌ۔ آدب:

---

[1] ابن الاثیر: النہایۃ، مادہ ادب۔ [2] ایضاً

اس شخص کو کہتے ہیں جو دسترخوان کی طرف بلاتا ہے، مادُبة اس کھانے کو کہتے ہیں جو دعوت کے لیے تیار کیا جاتا ہے، اس تشریح سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس لفظ کے اصل معنی "کھانا" ہیں، جیسا کہ بعض علمائے لغت کا خیال ہے۔ ان احادیث اور اقوال سے پتہ چلتا ہے کہ یہ لفظ عہد رسالتؐ، عہد صحابہ اور خود ایام جاہلیت میں جانا پہچانا تھا، صدر اسلام میں اس کے جو معنی تھے، اس میں وسعت پیدا ہوئی، اور وہ اخلاق کریمہ اور ان سے زندگی پر پڑنے والے اثرات کے معنی میں بولا جانے لگا، دعوتِ طعام ہو یا دعوتِ تہذیب جنس بہرحال دونوں میں مشترک ہے۔

ادب کے لغوی معنی دعوتِ ولیمہ اور اصطلاحی معنی دعوتِ تہذیبِ نفس ہے، جنس کے اشتراک اور فصل کے امتیاز سے دو نوعیں ہیں۔ چونکہ یہ لفظ عہد جاہلیت اور صدر اسلام میں کھانے اور تہذیب و تربیت کے مفہوم میں تھا، اور اب بھی یہی معنی ہیں، اس لیے یہ لفظ منقول ہے، مُرتجل نہیں ہے۔[1]

"لسان العرب" میں ادب کے لغوی معنی دعوت: بلانا ہے، وہ کھانا جس کی طرف لوگوں کو بلایا جاتا ہے، اس کو مدعاة اور مادبة کہتے ہیں، وہ لٹریچر جس سے ادیب، متادب ہوتا ہے اس کو ادب اس لیے کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کو اچھائیوں کی طرف بلاتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔

"المحیط" میں الادَبُ (متحرک الاوسط) کے معنی لطافتِ طبع اور خوش اطواری کے ہیں۔ ادّبه: علمه۔ سکھایا۔ تأدَّبَ به: تعلَّم به۔ سیکھا۔ الادْب (بسکون العین) کے معنی تعجب کے ہیں۔ جیسا کہ الادبة (بالضم) کے معنی تعجب اور پسندیدگی کے ہیں۔ اور ادب البحر کے معنی پانی کی زیادتی ہے۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ لغوی اور مستعمل فیہ معنی میں جنسی اشتراک ہے، کیونکہ ادب محامد و محاسن کی طرف بلاتا ہے۔

---

[1] معنی موضوع لہ اور مستعمل فیہ میں مناسبت ہو تو منقول ہے، جیسے صلوٰۃ اور اگر مناسبت نہیں ہے تو مرتجل ہے

اس کے علاوہ مادۂ ادب کا ایک اور دلچسپ پہلو ہے، اس کو اٹلی کے مشہور مستشرق کارلو نالینو (متوفی ۱۹۳۸ء) نے بیان کیا ہے، مستشرق مذکور کی رائے یہ ہے کہ ادب، دأْب سے نکلا ہے، جس کے معنی عادت ہے، یہ لفظ مفرد سے نہیں بنا بلکہ جمع سے مشتق ہے، دأْب کی جمع اداب تھی، قلب مکانی سے آداب ہو گیا، جیسے بِئْرٌ اور رِئْمٌ کی جمع أبْآر اور أرْآم تھی، قلب مکانی کے بعد آبار اور آرام ہو گئی۔ پروفیسر نالینو نے اس سے آگے لکھا ہے:

وكثر استعمال الآداب جمعا للدأب حتى نسي العرب اصل هذا الجمع و ما كان فيه من قلب فخيل اليهم انه جمع لا قلب فيه - فاخذوا منه مفرده ادبا لا دأبا وجرى استعمال هذه الكلمة بمعنى العادة. ثم انتقل من هذا المعنى الطبيعي القديم الى معانيه الاخرى المختلفة[1]

داب کی جمع آداب کا استعمال اسقدر زیادہ ہوا کہ عرب اس کی اصل ہی کو بھول گئے، نہ ان کو یہ یاد رہا کہ اس میں قلب مکانی ہوا ہے، ان کو اس بات کا خیال رہا کہ یہ لفظ جمع ہے اس میں قلب مکانی نہیں ہوا ہے، انھوں نے اس کا مفرد داب کے بجائے ادب سمجھا داب کا استعمال عادت کے معنی ہی میں رہا، پھر وہ اس قدیم طبعی معنی سے دوسرے مختلف معنی کی طرف منتقل ہوا ہے۔

لفظ ادب کی اصل تاریخ بنی امیہ کے عہد سے شروع ہوتی ہے، یہ لفظ بنی امیہ ہی کے زمانے میں رائج اور شائع ہوا، اسی زمانے سے اس لفظ کا استعمال سب سے پہلے تعلیم و تربیت کے معنی میں ہوا، عہد بنی امیہ میں اساتذہ کی ایک ایسی جماعت تھی جو امراء کے لڑکوں کو تعلیم و تربیت دینے پر مامور تھی، اس جماعت اور اشعار کے راویوں اور تاریخی واقعات بیان کرنے والوں کو "مؤدب"

---

[1] تاریخ الادب العربیہ تالیف کارلو نالینو، ص ۱۱

کہا جاتا تھا۔ اس جماعت "مؤدبین" میں سے کچھ نام یہ ہیں: (۱) ابو معبد الجہنی (۲) عامر الشعبی۔

(۱) ابو معبد الجہنی (۲) عامر الشعبی۔ یہ دونوں خلیفہ عبدالملک بن مروان کے لڑکوں کو تعلیم دیتے تھے۔

(۳) صالح بن کیسان: خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے لڑکوں کا مؤدب تھا۔

(۴) جعد بن درہم: آخری اموی خلیفہ، مروان بن محمد کا مؤدّب تھا۔

اس دور کی تحریروں میں جابجا لفظ ادب کا تذکرہ ملتا ہے، زیاد بن ابیہ اپنے خطبہ "البتراء"[1] میں کہتا ہے:

فادعوا الله بالصلاح لائمتكم	تم خدا سے اپنے ائمہ کیلئے راستی اور خیر کی
فانهما ساستكم المؤدبون لكم	دعا کرو، کیونکہ وہ تمہارا انتظام کرنیوالے
اما والله لاؤدّبنكم غير	اور ادب سکھانے والے ہیں، خدا کی قسم
هذا الأدب او لتستقيمن	میں تم کو اس طرز ادب کے سوا ادب سکھاؤں گا، ورنہ تم اپنی روش درست کر لو۔

کسی فزاری شاعر نے لفظ ادب کو اپنے اشعار میں اس طرح استعمال کیا ہے:

اكنيه حين اناديه لاكرمه	ولا القبه والسوءة اللقبا

میں اسکو محفل ازراہ احترام اسکو کنیت سے پکارتا ہوں، لقب سے یاد نہیں کرتا، کیونکہ لقب بری چیز ہے۔[2]

كذالك اُدّبت حتى صار من خلقي	اني وجدت ملاك الشيمة الادبا[3]

میری تہذیب و تربیت اس طور پر کیگئی ہے کہ ادب میری سرشت بن گئی ہے اور میں نے اپنی خصلت کا مدار ادب کو بنا لیا ہے۔

---

[1] جس خطبے کو حمد و ثناء سے شروع نہ کیا جائے اور جس کا آغاز حمد باری تعالی سے نہ ہو اس کو "البتراء" کہتے ہیں۔ بتر کے معنی دم کٹے، لاولد کے ہیں، اور جس خطبے کو قرآن مجید کی آیات اور درود سے مزین نہ کیا جائے اسکو "شوھاء" کہتے ہیں، شوھاء کے لغوی معنی بدصورت عورت کے ہیں [2] حماسہ: باب الادب۔

بنی امیہ کے زمانے میں اس لفظ کا اطلاق اس قسم کے علوم پر ہوتا تھا جن کا مذہب اور دینیات سے کوئی تعلق نہ ہو۔ جیسے شاعری، کہانی، انساب، ایام عرب، اخبار و احوال، شرافت اور حسن اخلاق بھی اس سے مراد لیے جاتے تھے۔ پھر جب لغت مدون ہوا تو وہ بھی ادب میں شامل ہو گیا۔

لفظ ادب کا مادہ نہ قریشی زبان میں ملتا ہے، نہ عبرانی اور سریانی میں۔ قرآن مجید نے تمام لغات قریشیہ کا استیعاب نہیں کیا تھا، اس لیے یہ بھی فرض کیا جاسکتا ہے کہ یہ لفظ عہد بنی امیہ میں قریش کی زبان میں کسی ایسی عربی زبان سے منتقل ہو کر آیا ہو جو خود برباد ہو چکی تھی۔

"لسان العرب" نے مادۂ ادب سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔

الادب ادبان: ادب النفس وادب الدرس۔ ادب دو ہی چیزوں کا نام ہے۔ ایک تہذیب نفسی اور دوسرے تعلیم شعر و نثر۔ تہذیب نفس۔ بردباری، عالی ظرفی، شجاعت، سچائی جیسی خصائل حمیدہ اور اجتماعی خوبیاں پیدا کرنے کی تلقین کو کہتے ہیں، غالباً یہی وجہ ہے کہ عبداللہ ابن مقفع (متوفی ۱۴۲ھ) نے اپنی کتاب کا نام "الادب الصغير والادب الكبير" رکھا، ادب کے دوسرے معنی تعلیم کے ہیں، اس کا تعلق شعر اور نثر سے ہے، پہلی صدی ہجری سے ابتک مادۂ ادب انہی دو معنوں پر دلالت کرتا رہا ہے۔

خلیفہ عبدالملک بن مروان نے اپنے لڑکوں کے مؤدّب سے کہا:

علّمهم الشعر يمجدوا وينجدوا[1]	انکو اشعار کی تعلیم دو تاکہ یہ شرف حاصل کریں اور دلیر بنیں

یہاں تادیب کے معنی تعلیم و تہذیب یا درست کرنے کے ہیں۔

خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے مؤدّب سے پوچھا

---

[1] نقد النثر ص ۸۰

كيف كانت طاعتي اياك و
انت تؤدبني؟ قال: احسن
طاعة، قال: فاطعني الآن
كنت اطيعك[1]

جب آپ مجھے تعلیم دیتے تھے تو میں آپ کی
کس طرح اطاعت کرتا تھا، مودب نے جواب دیا
بہترین اطاعت، عمر بن عبد العزیز نے کہا
تو اب تم میری ویسی ہی اطاعت کرو
جیسی میں تمھاری اطاعت کرتا تھا۔

بنی امیہ ہی کے عہد سے ادیب یا مودب، شاعر اور نثر نگار کے درمیان فرق قائم ہوا۔ جس شخص پر ادب اور اس کی تعلیم کا غلبہ ہوتا تھا، اس کو ادیب کہتے تھے، اور جس کا رجحان شاعری کی طرف ہوتا تھا، وہ شاعر کہا جاتا تھا، اور نثر کا مطالعہ کرنے والے کو نثر نگار کہا جاتا تھا۔

دوسری صدی ہجری کے نصف اول میں جب عربی علوم، لغت، نحو، صرف کا نشوونما ہوا تو ان علوم نے اصطلاحی شکل اختیار کرلی، اور یہ علوم "ادب تعلیمی" میں داخل ہوگئے، اب ادب تعلیمی کا مفہوم وسیع ہوگیا۔ لفظ ادب کا اطلاق۔ نثر و نظم، انساب، اخبار، لغت، نحو، صرف اور نقد پر ہونے لگا۔ یہ حالت زیادہ دنوں قائم نہیں رہ سکی، کیونکہ یہ عباسیوں کے زمانے میں سوسائٹی کے اجتماعی ہیئت میں تغیر اور ثقافتی گوشوں میں تنوع پیدا ہوا۔ عباسی تمدن کے ساتھ ساتھ علوم عربی کی ایک ایسی طاقت آئی جس نے مادۂ ادب کو متاثر کیا۔

تیسری صدی ہجری میں ادب پھر اپنے اسی مفہوم کی طرف واپس لوٹا جو پہلی صدی ہجری میں تھا، یعنی ادب فنی اور تہذیب نفس کے معنی دینے لگا۔ اس تعریف میں شعر و نثر اور ان سے متعلقہ علوم۔ اخبار، انساب، ایام عرب اور احکام نقد داخل ہیں، البتہ اس میں فنی نثر اور ادبی تنقید کا اضافہ ہوگیا۔

[1] عیون الاخبار لابن قتیبہ ج ۱ ص ۳۰۱ طبع مصر ۱۳۴۳ھ

اسی صدی میں اعلیٰ ادب تصنیف ہوا، جاحظ (متوفی ۲۵۵ھ) کی "البیان والتبیین" ابن قتیبہ (متوفی ۲۷۶ھ) کی "الشعر والشعراء" اور "کامل" للمبرد (متوفی ۲۸۵ھ) جو عربی ادب میں امہات الکتب تسلیم کی جاتی ہیں، اسی صدی میں لکھی گئیں۔

اسی صدی میں لفظ ادب کے تہذیب نفس والے معنی میں وسعت پیدا ہوئی، اور اس موضوع پر کچھ کتابیں بھی تصنیف کی گئیں، امام ابو یوسف (متوفی ۱۸۲ھ) کی "ادب القاضی" ابن قتیبہ کی "ادب القراۃ"، ابو العباس سرخسی (متوفی ۲۸۶ھ) کی "ادب النفس" اور کشاجم شاعر (متوفی ۳۵۰ھ) کی "ادب الندیم" اس سلسلے کی اہم کتابیں ہیں۔ صحیح بخاری (متوفی ۲۵۶ھ) کا "باب الادب" اور "حماسہ" ابی تمام (متوفی ۲۳۱ھ) کا "باب الادب" بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں، محمد بن سلام الجمحی (متوفی ۲۳۲ھ) کی مشہور کتاب "طبقات الشعراء الجاہلیین والاسلامیین" ابو الحسن الماوردی (متوفی ۴۵۰ھ) کی "ادب الدنیا والدین" اور نیشاپوری (متوفی ۴۶۵ھ) کی "آداب الصوفیہ" اور "آداب البحث والمناظرہ" کا ذکر بھی اسی ضمن میں آتا ہے۔

جاحظ نے لفظ ادب کئی جگہ استعمال کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

قال عتبة بن ابی سفیان لعبد
الصمد۔ مؤدب ولده: لكن
اول ما تبدأ به من اصلاح
بني، اصلاح نفسك[1]

عتبہ بن ابی سفیان نے اپنے لڑکے کے مودب
سے کہا کہ پہلی چیز جس سے تم میرے لڑکوں
کی اصلاح کرو، خود تمھارے اپنے نفس
کی اصلاح ہے۔

دوسری جگہ لکھا ہے:

وزدني في تاديبهم، ازدك
في بري انشاء الله تعالى[2]

ان کو ادب سکھانے میں زیادتی کرو، میں
حسن سلوک میں زیادتی کروں گا، انشاء اللہ تعالیٰ۔

[1] البیان والتبیین ج ۲ ص ۵، [2] ایضاً

چوتھی صدی ہجری میں لغت، نحو، صرف ادب سے الگ ہو گئے، نقد، بلاغت، اور بدیع ادب میں شامل رہے۔ ٹھوس ادب میں تنقیدی اور فنی زاویۂ نگاہ سے بحثیں ہوئیں۔ اس صدی میں بحتری (متوفی ۲۸۴ھ) اور ابو تمام (متوفی ۲۳۱ھ) کے ادبی معرکوں اور بعد میں متنبی (متوفی ۳۵۴ھ) کے مخالفین اور موافقین کے مباحث نے فن نقد کو فائدہ پہنچایا۔ آمدی (متوفی ۳۷۱ھ) نے اپنی "الموازنہ بین الطائیین" اور ابو الحسن جرجانی (متوفی ۳۹۲ھ) نے "الوساطۃ بین المتنبی وخصومہ" انہی واقعات سے متاثر ہو کر تصنیف کیں، اس طرح تنقید نے مستقل فن کی حیثیت اختیار کرنا شروع کی۔ اور اس کا شمار علٰحدہ ایک علم اور ادبی فن میں ہونے لگا۔

چوتھی صدی ہجری میں جن کتابوں نے فن نقد کو فروغ دیا، اور اس کو مستقل ایک فن کا درجہ دیا، ان میں قدامہ بن جعفر (متوفی ۳۱۰ھ) کی "نقد الشعر" اور "نقد النثر" کے نام سرفہرست ہیں، قدامہ نے سب سے پہلے عربی نقد کے اصول استخراج کیے، ان کے بعد ابوہلال العسکری (متوفی ۳۹۵ھ) نے "الصناعتین"[1] میں اور ابن رشیق القیروانی (متوفی ۴۵۷ھ) نے "کتاب العمدہ" میں انہی کے نقش قدم کی پیروی کی۔ ابو الفرج الاصبہانی (متوفی ۳۵۶ھ) کی "الاغانی" اور ابن عبد ربہ (متوفی ۳۲۸ھ) کی "العقد الفرید" کے نام بھی اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں، "رسائل اخوان الصفا" نے بھی تنقید اور علوم بلاغت کے لیے راستہ ہموار کیا۔ کہا جاتا ہے کہ فن نقد نے علم بلاغت کے ضمن میں مستقل فن کی شکل اختیار کی، اس استقلال کی مظہر شیخ عبد القاہر جرجانی (متوفی ۴۷۱ھ) کی دونوں کتابیں "دلائل الاعجاز" اور "اسرار البلاغت" ہیں۔

---

[1] اس کتاب میں مصنف نے شعر و نثر سے بحث کی ہے، اور جگہ جگہ ان محاسن کی نشان دہی کی ہے جن سے فنی حسن میں اضافہ ہوتا ہے، اس میں فنی تجزیے کے علاوہ تنقیدی بحث بھی ہے۔ مصنف کی دوسری کتاب "دیوان المعانی" بھی اسی طرز پر لکھی گئی ہے، لیکن اس میں روایتی انداز غالب ہے۔

ان کتابوں کا اثر یہ ہوا کہ ادب بمعنی الخاص سے نقد اور بلاغت کا تعلق نہیں رہا۔ اور اد محض نثر و نظم کے سرمایہ کو کہنے لگے۔

اس استقلال سے فن تنقید کو یہ نقصان پہنچا کہ اس کے بعد فن تنقید یا علم بلاغت میں کوئی ٹھوس کتاب نہیں لکھی گئی، اگرچہ ابن رشیق القیروانی کی "العمدۃ" اور "قراضۃ الذہب فی نقد اشعار العرب" شیخ کے زمانۂ حیات ہی میں تصنیف کی گئیں۔

پانچویں صدی ہجری کے اختتام تک اہم ادبی علوم نے مستقل علوم کی حیثیت اختیار کر لی، شاید اسی وجہ سے زیات نے لکھا ہے کہ عہد اخوان الصفا کے بعد لفظ ادب کا اطلاق فنون، صنعت و حرفت اور تمام غیر شرعی علوم پر نہیں رہا، لیکن عربی زبان کے علوم جیسے معانی، بیان، صرف، نحو اسکے دائرے میں داخل رہے لیکن اس قسم کی کوئی تجدید نہیں کی گئی۔[1]

غرض اس صدی میں ادب بمعنی الخاص کی تعریف کو مقبولیت حاصل ہوئی، یہ تجدید اس معنی سے قریب ہے جو قرن اول میں مستعمل تھے۔ اس تعریف سے وہ علوم الگ ہیں جو قرن ثانی میں ادبی تعریف کے جزء تھے۔ اس صدی میں علماء کی ایک ایسی جماعت پیدا ہوئی، جس نے قرن ثانی سے زیادہ ان ادبی علوم کی طرف توجہ دی جو ادبی ثقافت کی تعمیر کرتے ہیں۔

ادبی علوم سے مراد کیا ہے؟ وہ کون سے علوم ہیں جو ادب کی تعریف میں شامل ہیں؟ اس بارے میں علماء کا سخت اختلاف ہے۔ گذشتہ صدیوں سے اب تک ان ادبی علوم کے حصر و تحدید میں بڑے بڑے علماء نے حصہ لیا ہے، ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں:

زمخشری (متوفی ۵۳۸ھ) کے نزدیک علم بارہ[12] ہیں۔ سکاکی (متوفی ۶۲۶ھ) نے "مفتاح العلوم"، یاقوت حموی (متوفی ۶۲۶ھ) نے "معجم الادباء" اور شریف جرجانی (متوفی ۸۱۶ھ)

---

[1] اصول الادب ص ۱۱

نے "مقدمۂ شرح المفتاح" میں ان ادبی علوم سے بحث کی ہے، ان کے علاوہ دوسرے علماء نے بھی رائے زنی کی ہے، لیکن اس بارے میں ابن خلدون (متوفی ۸۰۸ھ) کی رائے کو اہمیت حاصل ہے۔

ابن خلدون نے اپنے مشہور مقدمے میں ایک فصل "فی علوم اللسان العربی" کے عنوان سے قائم کی ہے۔ اس میں علوم بلاغت۔ بیان، لغت، نحو پھر ادب سے بحث کی ہے۔ اور ادب کو زبان عربی کے علوم میں ایک مستقل علم تسلیم کیا ہے، اور اس کو نحو، لغت، معانی، بیان اور بدیع کا حریف ٹھہرایا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ ہر علم کا ایک موضوع ہوتا ہے جس میں اس کے عوارضِ ذاتیہ کے سلب و ثبوت سے بحث کی جاتی ہے جیسے طب کا موضوع جسم انسانی ہے، اس حیثیت سے کہ امراض، جسم انسانی کو لاحق ہوتے ہیں اور علاج کے ذریعہ ان کا تدارک کیا جاتا ہے۔ اسی طرح نحو کا موضوع کلمہ ہے، علم نحو، کلمے کے ان عوارض واحوال سے بحث کرتا ہے جو اس کو باعتبار معرب ومبنی پیش آتے ہیں، اسی ضمن میں نواسخ (عوامل) ضمیر عائد ان پر فتح یا کسرہ کے مقامات کا ذکر آتا ہے۔

تعجب یہ ہے کہ ابن خلدون ادب کو علم تو مانتا ہے، مگر اس کا موضوع نہیں بتاتا، اور اس کی غرض وغایت سے بحث کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ ہر علم کی ایک تعریف، ایک موضوع، اور ایک مقصد ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس نے خود لکھا ہے، ادب کے موضوع سے انکار کرتے ہوئے ابن خلدون نے لکھا ہے۔

هذا العلم لا موضوع له ينظر	علم ادب کا کوئی موضوع نہیں جس کے
فی اثبات عوارضه اونفیها	عوارض واحوال سے اثبات ونفی میں
وانما المقصود منه عند	بحث کی جائے۔ اہل زبان کے نزدیک

اهل اللسان ثمرته وهی	ادب کا مقصد ادبی سالت ہے، وہ
الاجادة فی فنی المنظوم والمنثور	یہ کہ نثر ونظم کے ذریعہ مانی الضمیر کا اظہار
علی اسالیب العرب ومناحیهم[۱]	عرب کے اسلوب اور طریقوں پر کیا جائے،

جب ابن خلدون نے علوم لسانی کی طرح ادب کا کوئی موضوع نہیں پایا تو اس کے موضوع ہی سے انکار کر دیا اگر وہ ادبی نسبت کا اطلاق تمام علوم لسانی پر کرتا تو بات آسان ہو جاتی اور وہ اس اضطراب میں مبتلا نہ ہوتا، جو اس کی حیرانی کا باعث ہوا، اس کا یہ فیصلہ منفرد رائے کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے تحیر واضطراب کا سبب یہ ہے کہ اس نے ادب کو علوم لسانی ہی میں سے ایک علم سمجھا، جو در اصل ادب کوئی علم نہیں ہے، بلکہ ایک کلامی فن ہے، جو ادیب سے صادر ہوتا ہے۔

ابن خلدون کا ادب کو علوم نظری میں شمار کرنا، اس کو طبیعت یا فطرت سے خارج کرنا ہے۔ ادب کو ایک موہبت فنیہ ہے، اس کا براہ راست تعلق طبیعت سے ہے، اس فن کی تحصیل، ادب پاروں، اشعار، نثر، لغوی اور نحوی مسائل کے مطالعہ سے ہوتی ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو ادب کا بھی ایک موضوع ہے، اور وہ ہے طبیعت یا فطرت، طبیعت یا فطرت سے مراد واردات (داخلیت) اور تاثرات (خارجیت) ہیں جن سے انسان اس مادی دنیا میں متصادم ہوتا ہے، انسان خارجی حقائق کا مظہر ہے، اور طبیعت داخلی کیفیات کی، ان پر تنقید وتبصرہ فطرت انسانی کا تقاضا ہے، داخلی یا خارجی عوامل کی ترجمانی کا نام طبیعت یا فطرت ہے، یہی ادب کا موضوع ہے،

داخلیت اور خارجیت میں ایک واضح فرق ہے، وہ یہ کہ خارجی اشیاء یا مدرکات حسیہ

---

[۱] مقدمہ ابن خلدون ص ۳۱۷ مطبوعہ مصر

کا تعلق انسان کے حواس ظاہری سے ہے، وجدان سے نہیں۔ انسان خارجی دنیا میں ان کا تجربہ
تجربے کرتا ہے، اور ان حسیات کو اپنے وجدانی تاثرات یا وجدان سے الگ رکھتا ہے۔ اس کے
برخلاف باطنی اشیا کے کہ وہ تجربوں، ضابطوں اور قاعدے قانون کی پابند نہیں، اندرونی
احساسات بدلتے رہتے ہیں، ان کا تعلق طبیعت انسانی اور وجدانی تاثرات و انفعالات
سے بلا واسطہ ہے، آج ایک چیز کو دیکھکر دل پر خوشی کا اثر ہوتا ہے، کل اسی چیز کو دیکھکر
خوشی نہیں ہوتی، اس سے معلوم ہوا کہ داخلیت (قلبی کیفیات) بھی تغیر پذیر ہے۔

ادب کی تعریف کرتے ہوئے ابن خلدون نے لکھا ہے۔

ثم انھم اذا ارادوا حد ھذا	جب انھوں نے اس فن کی تعریف
الفن. قالو: الادب ھو حفظ	کرنا چاہی تو کہا کہ ادب نام ہے اشعار
اشعار العرب و اخبارھا	اور ادبی تاریخ کے حفظ اور ہر علم سے
والاخذ من کل علم بطرف	تھوڑا تھوڑا حصہ حاصل کرنے کا، وہ
یریدون من علوم اللسان	لوگ علم سے مراد لسانی یا شرعی
اوالعلوم الشرعیۃ [1]	علوم لیتے ہیں۔

اس عبارت میں ابن خلدون ادب کو فن تسلیم کرتا ہے، اس سے پہلے اسی ادب کو علم
سے تعبیر کر چکا ہے، قطع نظر اس بات کے کہ ابن خلدون کے نزدیک ادب علم ہے یا فن۔

اس عبارت پر ایک اور اعتراض وارد ہوتا ہے، وہ یہ کہ ادب کی مذکورۂ بالا تعریف (جسکو
ابن خلدون نے اس طرح لکھا ہے، جیسے وہ کسی سے نقل کر رہا ہے۔ ثم انھم اذا ارادوا
حد ھذا الفن قالوا:) ادب کی ہے یا تادّب کی۔

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۳۱۷

اگر اس سے مراد ادب اور ادبی کتابیں ہیں، جو ہم پڑھتے ہیں اور ادیبوں اور شاعروں
سے سنتے ہیں تو یہ تعریف مکمل نہیں، اور اگر اس تعریف سے ان وسائل کا ذکر کرنا مقصود ہے جن کے
ذریعہ انسان اپنے ذوق ادبی کی جلا کرتا، انشا پردازی کی طاقت کو اجاگر کرتا اور تنقید و تبصرہ
کی صلاحیت پیدا کرتا ہے، تو یہ تعریف تادب کی ہے، ادب کی نہیں۔ کیونکہ تادب ادب سیکھنے
کو کہتے ہیں، جس کا بہترین وسیلہ کتاب ہے، ادب سیکھنے والا، لازمی ثقافت کی تحصیل جن وسائل
سے کرتا ہے، انکا ذکر ابن خلدون نے اس تعریف میں کیا ہے، یہ ثقافت متادب کی زبان درست کرتی ہے
اور اس کے ذوق ادبی کو نکھارتی ہے، اس لحاظ سے یہ تعریف ادب کے بجائے تحصیل ادب کی ہوگی۔

آرٹ (جمال)، شعر، خیال اور ادب ایسی اصطلاحات ہیں کہ انکی صحیح منطقی تعریف اس وقت
تک نہیں کیجا سکتی، جب تک ذہن میں ان کا مفہوم واضح نہ ہو، اسکے برعکس اشیائے حسیہ جیسے
مثلث (جیومیٹری)، جزیرہ (جغرافیہ) ٹھوس یا سیال اجسام کی تعریف ممکن ہوتی ہے، ابن خلدون
کے تحیر اور اضطرابی کیفیت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس کے ذہن میں ادب کا مفہوم واضح نہیں،
یہی وجہ ہے کہ ادب کی کوئی منطقی حد قائم نہیں کر سکا، اور نہ تعریف بالعوارض کرنے میں کامیاب ہوا،
جس سے ادب کی وضعی شکل سامنے آجاتی۔ اس نے جو کچھ تعریف کی ہے وہ جزئی ہے کلی نہیں۔

حاصل اس بحث کا یہ ہے کہ ادب ایک فن کلامی ہے، جو عقل کی تعبیر اور ادراک و شعور انسانی
کی ترجمانی کرتا ہے، وہ ایک مدلول عرضی ہے، اس کا تعلق تہذیب نفس اور انسانی خصائل
سے بھی ہے، اور انفرادی اور سماجی زندگی سے بھی۔

ادب کی بنا جذبہ ہے، جو ادب میں خلود پیدا کرتا ہے، اس جذبہ کی دو حیثیتیں ہیں، ایک کا تعلق خلود ادب
سے ہے، دوسری کا شخصیتِ ادیب کی ترجمانی سے۔ مادی اجسام کے مقابلہ میں ادبی عبارتیں قائم بالذات
ہوتی ہیں، ان میں باقی رہنے کی ایک ایسی صفتِ خلود ہوتی ہے کہ نہ اسے زمانہ فنا کر سکتا ہے اور نہ وہ

تحریریں جو بعد میں اس موضوع پر لکھی جاتی ہیں، پڑھنے والے ہر عہد میں ان کو پڑھتے ہیں، ان سے کبھی مستغنی نہیں ہو سکتے، عقل انسانی ترقی پذیر اور بدلنے والی شے ہے، تغیرات، جذبات کی ابدیت میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتے، اس لیے ادب فی نفسہ بقائے دوام کی صلاحیت رکھتا ہے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ جذبہ جلد زائل ہونے والی چیز ہے، اس لیے وہ ادب کی بقا کا باعث نہیں ہو سکتا، لیکن یہ تناقض وہمی ہے، در اصل جذبے کا زوال ہی ادب کی بقا ہے، وہ عاطفہ ہی کی سرعت زوال ہے، جو ادبی اثر کو خلود اور انفعالاتِ ادبی کو دوام بخشتی ہے،

اس بات کو کلی کے جذبۂ شگفتگی سے سمجھا جا سکتا ہے، جو ایک سادہ خارجی مثال ہے، غنچہ، جذبۂ شگفتگی ہے، وہ ایک لمحۂ مختصر جس میں کلی مسکرائی، کلی کے بقائے دوام کا سبب بنا، اثارتِ جذبہ نے کلی کو پھول بننے پر مجبور کیا، کلی پھول بنکر کھلکھلائی، پھول زینت انجمن اور محو چمن آرائی ہوا، اگر کلی پھول نہ بنتی تو ہزار تنگیٔ داماں کی شاکی ہوتی، کلی کا کلی رہنا اس کی موت تھا، جذبۂ شگفتگی نے اسکو جمال آگہی دیا اور جہانِ آب وخاک و باد میں لباسِ زندگی سے مزین کیا۔

تاثرات کی تعبیر کے وقت ہی ادیب کی شخصیت کھل کر سامنے آجاتی ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں ادب، فن کی شکل اختیار کرتا ہے، اور ادیب کی مزاجی ہیئت اور طرز ادا کی بھی ترجمانی کرتا ہے، تاثر نفسی کو ادبی خلود اور ادیب کی شخصیت کی ترجمانی میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اس سے ادب اور زندگی کا تعلق ظاہر ہوتا ہے، جو جذبات و واردات اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں، ان کو اشعار میں منظوم کرتا ہے، وہ جذبات ہم کو اسی طرح متاثر کرتے ہیں جس طرح خود شاعر نے محسوس کیے، اس تعریف کا اطلاق صرف شاعری پر ہی نہیں ہوتا، بلکہ تمام ادب کا یہی حال ہے، ادب تنقید حیات ہے، وہ زندگی کا شعور بھی ہے اور تفسیر حیات بھی، ادیب کے لیے سماجی شعور کے بغیر تفسیر حیات مشکل ہے، ادیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ حیات و کائنات کا مشاہدہ کرکے اپنے اندر سماجی شعور پیدا کرے۔

ادبی تاثیر اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب ادیب خارجی یا داخلی حسیاتِ جمال کی عکاسی اس طور پر کرے کہ تصویر کا حقیقی رخ پڑھنے والے کے سامنے آجائے، اس سے دل متاثر ہو اور ایسا ہی محسوس ہو جیسا کہ اصل تصویر میں ہے، وہ قوت جو اس تصویر کشی کی تکمیل کرتی ہے، اسکو قوتِ خیالیہ کہتے ہیں۔

جذبہ اور خیال کی طرح فکر بھی ادب کا ضروری عنصر ہے، ادبی موسیقی، جذبہ و فکر کی آمیزش سے نغمے جنم دیتی ہے، اور سروں کو لفظ و معنی کا لباس پہناتی ہے، جو عبارت دل پر اثر کرے وہ ادب ہے اور وہ افکار و حقائق جو ممتزج بالعواطف ہوں وہ بھی ادب ہیں، یہ ایک ایسی کسوٹی ہے جس کی روشنی میں ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ تاریخی کتابیں کب ادب بنتی ہیں۔

صحیح افکار، جذبے کو خلود دیتے ہیں، اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب ہم تنقید کی وادی میں قدم رکھتے ہیں، جذبہ نام ہے تاثیر عملی کا۔ شعور، وجدان، حس علم خیالی ہیں، تمام جزئیات سے ایک مشترک مفہوم اخذ کرنے کا نام فکر ہے، شعور جزئی ہے اور فکر کلی۔ اس لیے شعور اور فکر کے درمیان اتصال عینِ حقیقت ہے، خواہ یہ اتصال کمیت میں ہو یا کیفیت میں۔

جذبہ، فکر اور خیال کی طرح اسلوب بھی عناصر ادبی میں داخل ہے، اسلوب ایک حقیقت خارجیہ ہے جو مواد اور صورت کے امتزاج سے ادب کے خوبصورت مرقعے تیار کرتا ہے، وہ تخیل کو حقیقت اور واقعیت کی طرف لے جاتا ہے، ادب میں صورت و معنی کی ہم آہنگی ہی سے مرحلۂ شوق کی دشوار گذار راہ آسان بنجاتی ہے۔

اسلوب، جذبات کو برانگیختہ کرنے کا کام دیتا اور افکار کو لباس جمیل سے آراستہ کرتا ہے۔ اگر معانی متوسط اور خیالات فرسودہ ہوں لیکن اسلوب جاندار ہو تو عبارت میں موسیقی اور دلکشی آجاتی ہے، اسلوب ہی عبارت کو موثر اور خوبصورت بناتا ہے، اسلوب عارضی یا اتفاقی چیز نہیں فطری چیز ہے، جو ذوق سے حاصل ہوتا ہے۔

ہیئت۔ غایتِ ادبی نہیں۔ وہ ادائے معانی یا حقایق کی تعبیر کا ایک ذریعہ ہے۔ اس لیے نہ تنہا مواد سے کام چل سکتا ہے اور نہ شکل و صورت سے۔ ان دونوں میں تناسب ہم آہنگی اور ربط ضروری ہے، اسلوب ایک سماجی عمل ہے، اچھا اسلوب شعوری یا غیر شعوری طور پر زندگی اور ماحول کا ترجمان ہوتا ہے، ہیئت اور اظہار کی سماجی اہمیت یہ ہے کہ وہ ادیب اور قاری کے درمیان تعلق پیدا کرتا ہے، جمالیاتی اسلوب۔ نثر میں خیال کا آہنگ اور شعر میں جذبے کا ترنم بن جاتا ہے، فنکار اپنے جمالیاتی تجربے یا جذبے کے اظہار میں حسن کی تخلیق کرتا ہے انسان لاشعور، علامتوں اور تمثالوں کا سرچشمہ ہے، علامتی اظہار حسن کاری کو وجدان اور لاشعور سے قریب کرتا ہے، لاشعور کی اپنی ایک زبان ہوتی ہے، جسے اشاریت کہتے ہیں، دروں بینی اور اشاریت اظہار کو ماحول کا داغ اور تہذیب و تمدن کی زبان دیتی ہے، مادی کشمکش سے فنکار کا احساس جمال متاثر ہوتا ہے،

اشاریت ایک بے ساختہ ذریعۂ اظہار ہے، جو سبھی پابندیوں سے آزاد ہے۔ اس اعتبار سے ایمائی طرزِ فکر ایک فطری طریقہ ہے، وہ نفس کی گہرائیوں سے امنڈ کر نمودار ہوتا ہے، اشاریت، احساس کی ارتقائی منزل ہے، وہ الفاظ کو تصور زائی کی طرف لے جاتی ہے، تصور زائی ایک لازوال عطیۂ فطرت یا ناقابلِ اعتبار انتقال اسلوب ہے، جو کتاب یا ادبی عبارت کو قیمتِ خالدہ عطا کرتا ہے۔

ہندی شاعری کا ایک تاریخی جائزہ

از جناب زیدی جعفر رضا صاحب شعبۂ ہندی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۸)

چنتامن چنتامن (चिंतामीन) تکوان پور (کانپور) کے باشندہ رتناکر ترپاٹھی کے بیٹے تھے، بھوشن، مت رام اور جٹا شنکر ان کے بھائیوں کے نام تھے، علامہ آزاد بلگرامی نے ان کا تعارف اس طرح کرایا ہے،

"چنتامن ساکن کوڑہ جہان آباد است و دو برادر او بھوکن و مترام نیز شاعر خوش فکر مشہور اند .... در علم سنسکرت سر آمدِ اقران بود و در سرکار شاہ شجاع بن شاہ جہان بادشاہ باعزت بسر می برد"[1]

یہ کافی عرصہ تک ناگپور میں سورج ونسی بھونسلا راجہ مکرند شاہ کے یہاں مقیم رہے، اور ان ہی کے حکم پر انھوں نے اپنی تصنیف پنگل قلمبند کی جیسا کہ ان کی تحریر سے واضح ہے۔

سورج بنسی بھوسلہ لست ساہ مکرند ۔۔۔ مہاراج دگپال جم بھال سمد سجہ چند

چنتامن کو کو حکم کیو ساہ مکرند ۔۔۔ کرو کچھ پچھ پچھن سہت بھاشا پنگل چھند

چنتامن کا سنہ پیدائش ۱۶۰۹ء تسلیم کیا جاتا ہے، ان کی چھ تصانیف کا پتہ چلتا ہے جنکے نام کاویہ وویک، کوی کل کلپترو، کاویہ پرکاش، رس منجری، پنگل اور رامائن ہیں، انکے علاوہ کتب خانہ دتیہ میں شرنگار منجری نام کی ان کی ایک اور تصنیف ملی ہے، لیکن یہ کتاب دراصل شاہ اکبر

---

[1] علامہ آزاد بلگرامی - سرو آزاد، ص ۲۶ - ۳۹۵

کی آندھرا بھاشا میں لکھی ہوئی تصنیف ہے، جس کا ترجمہ سنسکرت سے ہوکر ہندی میں چنتامن کے ذریعہ ہوا، راماین کو چھوڑکر بقیہ سبھی تصانیف کا بیہ شاستر سے متعلق ہیں، ان کا سب سے زیادہ مشہور و مقبول گرنتھ کوی کل کلپترو (कविकल कल्पतरु) ہے۔

چنتامن کا شمار شرنگار کال کے اساتذہ میں ہوتا ہے، انھوں نے کیشو کی طرح بھامہ اور دنڈی کی تقلید نہیں کی، بلکہ ممٹ اور وشوناتھ کے راستے پر چلے، اور اس کے بعد ریتی کال کے مختلف آچاریوں نے چنتامن کی تقلید کی، رام چندر شکل ایک مقام پر رقم طراز ہیں:

"ہندی ریتی گرنتھوں کا سلسلہ چنتامن ترپاٹھی سے چلتا ہے۔ اسلیے ریتی کال کی ابتدا ان سے سمجھنی چاہیے۔"[1]

لیکن ڈاکٹر نگیندر شکل جی کے اس قول کی تردید کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"چنتامن کو بھی یہ فضیلت عطا کرنا ظلم ہے، کیونکہ یہ محض اتفاق تھا کہ ان کے بعد ریتی کال کا دھارا بغیر کسی رکاوٹ کے بہہ نکلا۔" (ڈاکٹر نگیندر۔ ریتی کابیہ سنگرہ، صفحہ ۲۳-۱۴)

چنتامن کے کلام کے بارے میں ڈاکٹر جگدیش گپت کا یہ خیال ہے کہ آچاریہ ہونے کے باوجود شعریت کے لحاظ سے چنتامن کا مقام کافی بلند ہے، رس وادی شاعر ہونے کی بنا پر ان کے کلام میں شرنگار رس کا بیان تفصیل سے ہے، لیکن اس میں متی رام اور دیو جیسے شعرائے متاخرین کی جیسی معنویت نہیں پائی جاتی البتہ تخئیل کی سادگی اور زبان کی سلاست کے لحاظ سے یہ متی رام کے مقابلہ میں ضرور لائے جاسکتے ہیں، ان کا کلام مجموعی طور سے نہایت صاف ستھرا ہے، اس میں ایک ترنم اور نغمگی پائی جاتی ہے، (ڈاکٹر جگدیش گپت، ہندی ساہتیہ کوش صفحہ ۱۷۳)

نمونۂ کلام یہ ہے:

کیسر بارہ بار آرت کیسر انگ لگاون لاگی آئی ہیے نینن جھپلتا دُرگیے آنچل آپ چھپاون لاگی

دولھ کے اولوکن کو وا اُمان جھوکن آون لاگی دوس دو تنیک تھکے بتیا من بھاون کی من بھاون لاگی

---

[1] رام چندر شکل: ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۲۵۹

دیو | دیو کا پورا نام دیودت تھا، سنہ پیدائش ۱۶۷۳ء ہے، یہ اٹاوہ کے باشندے تھے جس کا ذکر انھوں نے بھاو ولاس میں کیا ہے،

دیو سریا کوی دیو کو نگر اٹایو باس جودن نول سبھا ورس کیھو بھاو ولاس

اس دوہے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ کانیہ کبج (कान्यकुब्ज) برہمن تھے، کیونکہ دیو سرایا کانیہ کبج برہمنوں کو کہتے ہیں۔ دیو کی زندگی کا ابتدائی حصہ مالی اعتبار سے اچھا نہیں تھا، ایک غریب گھر میں پیدا ہونے والا یہ فنکار فکر معاش میں مختلف درباروں کی خاک چھانتا پھرا، کبھی اس نے اعظم شاہ کے سنگ در پر سجدہ کے لیے جبین نیاز خم کی اور بھاو ولاس اور اشٹ یام جیسی تصانیف حصول انعام کے خاطر نذر کیں، کبھی راجہ سیتارام کے بھتیجے سیٹھ بھوانی دت کے لیے بھوانی ولاس لکھی کبھی ریاست پھپھوند کے راجہ کشل سنگھ کی دلجوئی کے لیے کشل ولاس تصنیف کی، کبھی سیٹھ بھوگ لال کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا اور کبھی راجہ ادیوت سنگھ کے نام پر پریم چندر کا پیش کی، کبھی دلی کے رئیس پابی رام کے بیٹے سجان من کیلئے سجان ونود لکھی اور کبھی پہانی کے حاکم اکبر علی خاں کی خدمت میں سکھ ساگر ترنگ پیش کیا،

دیو کی تصانیف کا دائرہ بڑا وسیع اور ہمہ گیر ہے، ان کی تعداد کوئی ۵۲ بتاتا ہے اور کوئی ۷۲۔ ان میں سے ۱۸ کتابوں کے قلمی نسخے حاصل ہوچکے ہیں۔ شرنگار کال کے کسی اور شاعر نے اتنی تعداد میں اور اس قدر وسعت نظر کے ساتھ تصنیف نہیں کی، دیو دراصل ایک رومان پرور اور عاشق مزاج شاعر تھے، رومانیت اور تعشق ان کے کلام کا نمایاں حصہ ہے، ان کی منظومات میں سے جس شعر کو بھی اٹھا لیجئے وہ محبت کی چاشنی، رومان کی لذت سے خالی نہ ہوگی۔

دیو کے کلام میں تخیل کو بڑا دخل ہے، وہ تخیل کے سہارے ایسے مجسمے تراشتے ہیں جو حسن کے اعتبار سے بے نظیر ہیں، دیو کی شاعری تاثراتی ہے، اس لیے پرکشش اور پرکیف بھی ہے، جذبات کے مطابق زبان میں لوچ پیدا کرنا دیو کا خاص حصہ ہے، قواعد کے اعتبار سے دیو کی زبان میں کچھ کمی ضرور نظر آتی ہے لیکن کسی محبوبہ کی

کے تحت ادا کیا ہے، اس سے اس کی صلاحیتوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا، نمونۂ کلام یہ ہے،

دیو میں سیس بسایو سنیہ کے بھال مرگ مسی بندی کے بھا کھیو — کنچکی میں چپریو کر چیوا لگائی لیوا رسون ابھلا کھیو

کے کھمول گے گہنے رس موتی دمن سنگار کے جاکھیو — سانورے لال کو سانورو روپ مین کو کجرا کر راکھیو

متی رام کی پیدائش سمبت ۱۶۷۴ میں ضلع کانپور کے ایک گاؤں تکوان پور میں ہوئی، ڈاکٹر بھگیرتھ مصر نے اس گاؤں کا نام ٹکیا پور لکھا ہے جو صحیح ہے، متی رام، چنتامن اور بھوشن کے بھائی تھے، ان کا کلام شیرینی اور حسن کے لحاظ سے بہت خوبصورت ہے، متی رام کی طبیعت کا جھکاؤ رس کی طرف زیادہ ہے ان کی مشہور تصانیف میں للت للام، رس راج، پھول منجری، چھند سار سنگل، ست سئی، ساہتیہ سار لکچھن سرنگار اور النکار پنچاشکا ہیں، ان تصانیف میں للت للام اور رس راج زیادہ مقبول ہیں،

للت للام (ललित ललाम) النکار سے متعلق ہے، اور بوندی کے حاکم بھاؤ سنگھ کی تعریف میں ہے، اس میں چتر کے علاوہ باقی سب النکاروں کو صنعت معنوی یا ارتھالنکار تسلیم کیا گیا ہے انھیں پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صنعتوں کی تعریف میں شاعر نے کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ چنانچہ اس کی پیش کردہ مثالیں بیشتر مقامات پر صنعتوں کی تعریف سے میل نہیں کھاتیں، تاہم بعض مقامات پر شاعر نے صنعت کی تعریف اور اس کی مثالیں بڑی خوبصورتی سے پیش کی ہیں، مثلاً اپما النکار یا صنعت تشبیہ کی تعریف وہ یوں کرتا ہے۔

جا کو ورنن کیجیے سو اپمیہ پرمان — جا کی سمتا دیجیے تاہ کہت اپمان

جہاں برنئے دھن کو سم چھب کو اُلاس — پنڈت کب متی رام تہہ اپما کہت پرکاس

اور اس کی مثال پیش کر کے اس کو اور واضح کر دیا ہے۔

متی رام کی دوسری مقبول تصنیف رس راج ہے جس میں تعشق کے ذیل میں نائیکاؤں کے اقسام پر تفصیل سے لکھا ہے، متی رام کے نزدیک نائیکا وہ ہے جس کو دیکھ کر قلب کی گہرائیوں میں انبساط یا

رس پیدا ہو ؎

اپجت جاہ ولوک کے چت بیچ رس بھاو

لیکن یہ تعریف ناقص ہے، حریف کو دیکھ کر اگر دل میں انتقام کا جذبہ پیدا ہو تو حریف کو نائیکا نہیں کہہ سکتے، رس راج اصلاً کا بیہ گرنتھ ہے، شاستر گرنتھ نہیں، شاستریہ کی کسوٹی پر اس میں کمی پائی جا سکتی ہے، شرنگار اور نائیکا بھید کے بیشتر گرنتھ اسی نوعیت کے ہیں، سکھ دیو مصر کا رسارنو بھی نائیکا بھید کا ہی گرنتھ ہے، اس کے علاوہ رام جی کا نائیکا بھید گوپال رام کا رس ساگر، لبرام کا رس دیویک کلیان داس کا رس چند وغیرہ گرنتھ بھی اسی طرح کے ہیں۔

نائیکا کے بیان میں متی رام کا ذیل کا سویا بہت مقبول ہے،

کندن کو رنگ پھیکو لگے جھلکے ات انگن چارو گرائی — انکھن میں السان چتونی میں منج ولاس کی سرسائی

کو بن مول بکات نہیں متی رام لہے مسکان مٹھائی — جیوں جیوں نہاریئے نیرے ہوئے نینن تیوں تیوں کھری نکرسی نکائی

متی رام کے نائیکا بھید میں اکبر شاہ کی رس منجری کی ہی تقلید کی گئی ہے، سوکیا یعنی عفیفہ کی تین قسمیں مگدھا (صغیرہ) مدھیا (متوسط) اور پروڑھا (کبیرہ)، صغیرہ کی قسموں میں نووڑھا یعنی نافرہ اور وشربھ نووڑھا یعنی راغبہ، مدھیا یا متوسط کی قسموں میں دھیرا (صابرہ) ادھیرا (غیر صابرہ) اور دھیرادھیرا (صابرہ غیر صابرہ) اور اسی طرح پروڑھا کی بھی دھیرا، ادھیرا، اور دھیرا دھیرا قسمیں۔ اور پرکیا یعنی بغیہ کی قسموں میں گپتا (مختفیہ)، بدگدھا (فاطنہ) کلٹا (فاسقہ) انوشیانا (نادمہ) لکچھتا (مستترہ)، مدتا (معلنہ) انوڑھا (باکرہ) اور اوڑھا (ثیّبہ) کا بیان ہے۔

اس کے علاوہ پریم گربتا، روپ گربتا اور مان گربتا نائیکاؤں کا بیان متی رام نے کیا ہے۔ اس کے بعد پروشت پتکا، کھنڈتا، کلہنترتا، بپرلبدھا، اتکنٹھتا، واسک سجا، سوادھین پتکا، ابھسارکا پرواتسیت پریسی اور آگت پتکا کا بیان ہے۔ نایک کے اقسام میں متی رام نے پتی، اپ پتی،

اور ویسک تین قسمیں درج کی ہیں، اس کے بعد چار طرح کے نایک۔ انوکول، دچھن، شٹھ اور دھرشٹ کا بیان ہے، یہ اقسام پتی بھید کے ذیل میں ہیں، اُپ پتی اور ویسک کی قسمیں علیٰحدہ بیان کی گئی ہیں۔

مدھنایک | مدھنایک کا ذکر بھکتی کال کے شعراء کے ساتھ کیا جا چکا ہے، لیکن مدھنایک چونکہ اصلاً ریتی اور شرنگار کے شاعر ہیں، اسی لیے یہاں ان کا ذکر کرنا اشد ضروری ہے، بلگرام کے ہندی شعراء میں مدھنایک کا مقام سب سے زیادہ بلند ہے، کابیہ شاستر اور موسیقی کے آچاریہ مدھنایک شرنگار کال کے ہندی شعراء کی محفل کا ایک بیش قیمت جوہر ہیں، مدھنایک ایک ہی وقت میں ایک بے مثال موسیقار، ایک کامیاب شاعر، ایک عظیم آچاریہ اور ایک سچے عاشق ہیں۔

مدھنایک (मध्य नायक) کے تخلص کو ہندی کے محققین نے مختلف انداز سے لکھا ہے، ڈاکٹر بھگیرتھ مصرا اسے مدنایک (मदनायक) لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر برج کشور مصر کے یہاں یہ لفظ میرزا مدنایک ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر شو لعل جوشی نے اسے مدھونایک (मधुनायक) لکھا ہے اور شری گوپال چندر سنگھ اسے مدھنایک لکھتے ہیں۔ مدھنایک کا تخلص دراصل مدھنایک ہی تھا، مدھونایک یا مدھنایک نہیں، چنانچہ شاعر بلگرامی خلف میر عبد الجلیل بلگرامی تبصرۃ الناظرین میں لکھتے ہیں:

"اما مدھنایک لفظے است ہندی معنی آں واسطۃ القلادہ یعنی جوہر میانہ حمیل کہ بسیار خوب و گزیدہ تر می باشد، چوں سید مشار الیہ تخلص در شعر ہندی ہمی لفظ می کردند لہذا بایں نام اشتہار یافتند۔" (قلمی حبیب گنج فارسی ۳۳/۱۳ مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

مدھنایک نے بھی ایک دوہے میں اپنے اس تخلص کی طرف اشارہ کیا ہے۔

کٹ مول مَن لال دُت ادے ٹیک مَن جوت ‖ برن جنی جسم ار دھی مدھنایک مدھ ہوت

مدھنایک نے اپنی پوری شاعری میں ایسے الفاظ کا انتخاب کیا ہے کہ پڑھنے والا انکی نغمگی میں کھو جانے پر مجبور ہو جاتا ہے، مدھنایک کے اشعار موسیقی کو ساتھ لیکر چلتے ہیں۔ ذیل میں شاعر نے دھیرا نائیکا

کو خوبصورت سیج پر محو خواب دکھایا ہے، شاعر کے انداز بیان اور منظر کشی میں کتنی دلکشی ہے۔

سووت سروج مکھی سکھ سیج ہیت اتھکارن سدن سکھ پاتی کے
ڈھانکی پٹ آنچر لپیٹ مکھ سکھ ہوتیں پت پیاری نرکھ نرکھ للچاتی کے
پوڑھ ڈھنگ سم بھرم سکچ آن ہت جان پاوے نہ چپل چل چھدن چھپاتی کے
چھاتی لائی لائی ہاتھی بھانوتی انیدی کینھیں جیلی جیہہ چاہیں لیس سوت جگائی کے

سر سے پاؤں تک باریک ڈوپٹہ میں لپٹی ہوئی نائیکا کو دیکھکر اس کا محب مچل اٹھتا ہے، اور آہستہ آہستہ جگا دیتا ہے، جگانے کا انداز بھی خوب ہے۔ ذیل کے چھند میں نایک کرشن کو زرد رنگ کی پچھوری اوڑھے لپیٹے ہوئے آتا ہوا دیکھکر نائیکا کی آنکھوں میں ڈبڈبائے ہوئے آنسوؤں کی زبانی شاعر نے جانے کیا کچھ کہہ دینا چاہتا ہے

چندن چیر ہو تن سانورے کا چھن ہو ہیت آوت سوہن
پیت پچھوری پچھاہن چھاجت نینن رنگ رچیو رت چھوہن
کنڈل منڈت منجل منجری نوتن نوت لت کری جوہن
آنسن کی اولی امڈے مدھنایک بال بلوکت موہن

مدھنایک جی نے اپنی تصنیف مدھنایک سنگار میں رس کے بیان اور نائیکا بھید کو اپنا موضوع قرار دیا ہے، مدھنایک جی کا نائیکا بھید قدیم روایتوں کی تقلید کے باوجود انوکھا اور نرالا ہے، انکی شاعری میں کہیں کہیں فطرت کے خوبصورت مناظر بھی ہیں لیکن فطرت کا آزاد تصور شاعر کے یہاں نظر نہیں آتا۔ برسات کا ایک منظر یہ ہے:

برکھت بوندن اکھنڈ دھارا دھارا دھر جھون دھان دمنی لیٹ دام دامنی
بھرے نیر ساگر امنڈ چلے ندی ندناری کھوری سیت کھیت پنک پانی جامنی
اور ڈھور لبسکو نیم اتیو پریم کہا موسے آن بھون نہ بھاوے بھوری بھامنی
آئیے ہیں جو پریمی تو کھی کالی نیمی سجنی رے ہوئی ہیں نئی ناگ نویلی کام کامنی